PK
2198
M87Z86

Siddīqī, Abū al Lais
Mushafi aur un ka kalam

PLEASE DO NOT REMOVE
CARDS OR SLIPS FROM THIS POCKET

UNIVERSITY OF TORONTO LIBRARY

Order No. L-246939
List No. I
Serial No. 28
Supplied by
THE ORIENTAL CLASSICAL LITERATURE CORPORATION
POST BOX 5464. KARACHI 2 (PAKISTAN)

گر کسے مرتبہ شاعریش نہمیدے
مصحفی ہم بکف خود قلم مانی داشت

Siddiqi, Abul Lais

مصحفی اور اُن کا کلام

Muṣḥafi aur un kā Kalām

از

ڈاکٹر محمد ابو اللیث صدیقی۔ بی اے آنرز ایم اے پی ایچ۔ ڈی،
شعبہ اردو۔ پنجاب یونیورسٹی

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری گیٹ لاہور

جنرل بک ڈپو
[illegible]
238595

PK
2198
M87Z86

LIBRARY
JUL 19 1967
UNIVERSITY OF TORONTO

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میر تقی میر کے بعد بحیثیت مجموعی اُردو شاعری کے دورِ قدیم میں مصحفی کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ میر کی طرح وہ بیک وقت شاعر اور ناقد تھے۔ میر سے تو صرف ایک تذکرہ نکات الشعرا یادگار ہے۔ مصحفی کی تصنیفات میں عقد ثریا، تذکرہ ہندی گویاں اور ریاض الفصحا تین تذکرے ہیں۔ اُن کے ضخیم کلیات میں علاوہ غزلوں، مثنویوں، قصیدوں، رباعیوں اور قطعات کے کئی نثر تصانیف بھی شامل ہیں۔ ان میں فارسی اور عربی دونوں زبانوں کی تحریریں ہیں۔ اُردو نثر میں البتہ اب تک ان کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہوا لیکن جو کچھ بھی سرمایہ موجود ہے وہ مصحفی کی ہمہ دانی، علمیت، شاعرانہ مذاق غرض ان کی شخصیت کی ایک مکمل تصویر پیش کرنے کے لئے کافی ہے۔ البتہ اس کلام کا بڑا حصہ اب تک نایاب ہے۔ مطبوعات میں ایک دیوان کا انتخاب ہے جسے حسرت نے پہلے اردوئے معلیٰ میں اور پھر اپنے انتخابِ سخن میں شائع کیا۔ مثنوی بحر المحبت جو میر کی دریائے عشق کے جواب میں ہے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

تینوں تذکرے مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمات کے ساتھ انجمن ترقی اردو نے چھاپ دیئے ہیں، کچھ کلام متفرق رسالوں خاص کر نگار مصحفی نمبر میں شائع ہوا ہے۔ لیکن مصحفی کی کلیات کا یہ ایک قلیل حصہ ہے۔ اور یقیناً اس سے بہتر کلام ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ مجھے پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کے نوادر میں کلیات کا ایک نسخہ ملا ہے۔ میرے علم میں اس کے اور نسخے نایاب ہیں۔ برٹش میوزیم، انڈیا آفس، لٹن لائبریری علی گڑھ، کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ ریاست رام پور میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔ اس کتاب کا مقصد دراصل انہی کلیات کا تعارف کرانا ہے۔ اسکی ترتیب و تدوین میں نے شروع کر دی ہے۔ اور انشاءاللہ جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی۔

مولانا حسرت موہانی مصحفی کی تاریخ ولادت سنہ ۱۱۶۰ھ[1] مطابق سنہ ۱۷۴۷ء بتاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کا استدلال ہے کہ ان کا سنہ ولادت سنہ ۱۱۴۲ھ ۱۷۲۹ء اور سنہ ۱۱۵۶ھ ۱۷۴۳ء کے درمیان ہے۔ کیونکہ ریاض الفصحاء میں (سنہ ۱۲۲۱ھ تا سنہ ۱۲۳۶ھ) وہ خود اپنی عمر ۸۰ برس کی بتلاتے ہیں، لیکن مصحفی "قریب ہشتاد و سیپارہ باشد" لکھتے ہیں۔ قریب کے لفظ پر غور کریں تو عبدالحق صاحب کی آخری تاریخ سنہ ۱۱۵۶ھ اور حسرت کی تاریخ سنہ ۱۱۶۰ھ میں فرق اور کم رہ جاتا ہے۔ شاعری اور زندگی کے بارہ میں داخلی شہادتوں میں ایک ریاض الفصحا ان کا اپنا لکھا ہوا تذکرہ ہے۔ اپنے بیان میں لکھتے ہیں

---

[1] بحوالہ مضمون حسرت موہانی مطبوعہ اردوئے معلیٰ جون سنہ ۱۹۰۶ء

"من کہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی تخلص ام حسب و نسبم از کتاب مجمع الفواید[1] معلوم نمائی چون پیش ازیں تذکرہ فارسی و ہندی جمع کردہ ام بسبب بریں تالیف کثرت موزونان دیار لکھنؤ کہ بالفعل آبادی شاہجہان آباد بپاسنگ او نمی رسد شد، اگر از تحصیل علم من پرسی گویم بتو کہ تکمیل فارسی و نظم و نثر آن بشاہجہان آباد در سی سالگی بخوبی بسر آمدہ او را یا میکہ جلائے وطن کردہ دریں دیار تازہ

---

[1] حسب نسب کے بارہ میں مجمع الفوائد میں لکھتے ہیں کہ میں نے جو کچھ اپنے اجداد سے سنا ہے وہ یہ ہے کہ سید مسعود شاہ علی کا قیام موضع اکبرپور میں تھا۔ جو موضع سنبھادلی اور موضع برشیخ پور کے درمیان واقع ہے۔ موضع گھروڈہ کے زمینداروں نے قدیم دشمنی کی بنا پر اس موضع کے تمام مرد و عورتوں کو قتل کر ڈالا ایک بچہ نظام الدین نام تھا۔ جسے اس کی والدہ نے بسبب محبت مادری ایک گڑھے میں ڈال دیا۔ اور خود قتل کر دی گئیں۔ اتفاق سے موضع برشیخ پور کی ایک بوڑھی عورت مقتولوں کا تماشا دیکھنے آئی تو اس بچہ پر نظر پڑ گئی وہ اسے اُٹھا لے گئی اور پرورش کیا۔ بارہ سال کی عمر کو پہنچے تو معلوم ہوا کہ اصل میں کیا واقعہ پیش آیا تھا چنانچہ یہ دکن چلے گئے۔ اور وہاں ایک سقہ کے یہاں مقیم ہو گئے۔ وہ سقہ خاندان سادات میں ایک جگہ پانی پہنچاتا تھا، ایک دن ان کو بھی ساتھ لے گیا۔ ان کی پیشانی سے شرافت و سعادت ظاہر تھی۔ چنانچہ خاتونِ خانہ نے انہیں اپنا فرزند بنایا، زیورِ علم و تہذیب سے آراستہ کیا۔ اور اپنی دختر سے شادی کر دی بعد میں پتہ چلا کہ شیخ نظام کے دادا راجپوت تھے۔ اُن کے بیٹے یعنی شیخ نظام کے والد اسلام لائے تھے۔ اس سے اس سعیدہ کے رشتہ داروں کو صدمہ ہوا کہ ایک نومسلم نے سیّد ہونے کا دھوکہ دیا چنانچہ تعلقات کی کشیدگی دور کرنے کے لیے یہ وہاں سے چلے گئے۔

(باقی صفحہ ۴ پر)

آمدہ قیام ورزیدم علم عربی یعنی طبیعی و الٰہی و ریاضی از مولوی مستقیم سلمہ گویا مستوفا گرد
مولوی حسن خواجہ تاش مولوی مبین عالم العلماء خواندہ ام۔ میبذی صدرا نہ بلا شد

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵ سے آگے۔

بی سیدانی یعنی شیخ نظام کی زوجہ نے ان سے کہا۔ کہ مجھ سے تمہاری نسل نہیں چلے گی، اس لئے تم اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کرو۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ یہ شیخ نظام کا مقبرہ سنگین بقول مصحفی اُن کے وقت تک موضع اکبرپور میں موجود تھا۔ یہ شیخ صاحب سے مصحفی تک بارہ پشتیں گزریں۔ والد کا نام ولی محمد اور دادا کا نام شیخ درویش محمد تھا۔ مصحفی کے تین بھائی اور تھے۔ بڑے بھائی جن کا نام غلام جیلانی تھا تیس سال کی عمر میں لاولد فوت ہوگئے۔ یہ امروہہ میں اپنے دادا کی قبر کے پاس دفن ہوئے۔ دوسرے بھائی کا نام غلام صمدانی تھا۔ اُن کی شادی ہوگئی تھی اور بال بچوں والے آدمی تھے۔ لیکن اولاد بچپن ہی میں مر گئی۔ اُن میں سے صرف دو فرزند باقی رہ گئے تھے۔ بڑے بیٹے کی عمر قریب بیس سال کی تھی شادی نہ ہونے پائی تھی کہ عین عالم جوانی میں پیام اجل آپہنچا۔ دوسرے بیٹے کی شادی خاندان میں ہوگئی۔ لیکن مجمع الفوائد کی تصنیف کے وقت مصحفی لکھتے ہیں کہ اب تک اُس سے نہ کوئی لڑکا پیدا ہوا ہے نہ لڑکی۔ تیسرے بھائی کا نام مصحفی نہیں بتلاتے صرف اس قدر لکھتے ہیں کہ اُس کی شادی ہوگئی تھی۔ ایک لڑکی پیدا ہوئی بچہ زچہ دونوں مر گئے۔ اور اس جوان نے جہان فانی پر نظر کر کے لباس فقیری اختیار کیا اور ایک درویش کی خدمت میں رہنے لگا۔ اپنے متعلق مصحفی کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ میں اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ نکاح شرعی کے بعد میرے ایک لڑکی پیدا ہوئی، اُس کی والدہ اسی دوران میں فوت ہوگئی۔ (باقی صفحہ چھ پر)

بود قانونچہ از مولوی محمد مظہر علی کہ در علم صرف و نحو ثانی الثنان کم پیدا می شود دریافتہ غرض آخر عمر از فضل الٰہی بہ عربیت تفاسیر قرآن مجید را بہم رسانیدم کہ

فٹ نوٹ صفحہ ۵ سے آگے :-

اور بچی بھی ایک ماہ بعد انتقال کر گئی اور اس کے بعد تقریباً تیس سال ہوئے ہونگے یا کچھ زیادہ کہ میں لکھنؤ میں مقیم ہوں، لکھنؤ ۱۱۸۵-۱۱۸۰ھ ۱۷۸۲ء کے قریب پہنچے. جیسا کہ تفصیل سے آگے مذکور ہے۔ اس حساب سے مجمع الفوائد ۱۲۱۰-۱۲ھ کے قریب کی تصنیف ہے۔

اس کے بعد بقول خود مصحفی نے ایک زن مدخولہ نکاح و متعہ سے تعلق پیدا کر لیا۔ اس نے تین حمل اسقاط کرائے۔ رنج بدنامی کے خیال سے اُس سے بیزار ہو کر جدائی اختیار کی۔ اس کے بعد ایک عورت سے عشق ہو گیا، خود اقرار کرتے ہیں کہ وہ کوچہ گرد تھی۔ چند روز گھر کی چار دیواری میں بیٹھی، اور دوآئی کے بہکانے سے مجھ سے جدائی طلب کی۔ ایک سال کے بعد اس سے قطع تعلق ہو گیا (له)۔ اسی دوران میں ایک اور عورت سے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری تھا۔ چنانچہ زنا سے بچنے کے لیے اس سے متعہ کر لیا۔ جس کے متعلق لکھتے ہیں کہ "محکم تر از نکاح است" جس وقت مجمع الفوائد لکھ رہے تھے، اس کو بارہ سال ہو چکے تھے لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اور مصحفی خود مایوس ہو چکے تھے۔ البتہ وہ اپنے فرزندان معنوی یعنی کلام نظم و نثر کو دیکھ کر دل شاد کرتے تھے

اس بیان کو مصحفی ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں :-

با وصف کم بغلی و عیب ہزالی شہرت نام من از مشرق تا مغرب در زندگی من شدہ و امیر و امیرزادہا با ہمیں سبب عزت من میکنند، اگرچہ من کار بے عزتی میکنم کہ شعر فاسقانہ و عاشقانہ میگویم اما چون جوہر سخن ناں ہم در طلب خود دارم ازیں جہت کلام من مقبول طبائع بزرگاں

له صفحہ ۷ پر دیکھئے :

تصنیف دیوان عربی را ارادہ می کردم نیز صورت می بست بلکہ قریب یک جزو غزلیات
دیگر دو صد قصیدہ نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ گفتہ بودم آں جزو مسودہ

فٹ نوٹ نمبر ۱ صفحہ ۶ سے آگے :۔

روزگار افتادہ الا اگر خفیفت خود را بنگرم از سوء چہ چارہ کمترم زخاک ناچیز را دیگر مبالغہ بیجا است باہیچ عیبے بہ عیب مفلسی بدر دنیا نمی رسد۔ چہ کنم بہ بخت، اختیار ندارم در زمان تردد۔ تردد نگیرم حالانکہ سنہ عمر از شصت متجاوز است چہ تردد از من ناتواں آید۔ ایں شعر حسب حال خود دریں وقت میدانم زیادہ از نوشتن ہزار بیت از من ناتواں

شعر

بر کف نہادہ سر بامید دل نشستہ ایم   در انتظار وعدہ قاتل نشستہ ایم

(یہ مجمع الفوائد کی عبارت کا خلاصہ ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ کلیاتِ مصحفی قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری صفحات ۳۲۶ تا ۳۲۸)

فٹ نوٹ نمبر ۱ صفحہ ۶

[1] ان دو میں سے ایک کا نام شدید عصمت تھا۔ اس کا اشارہ مصحفی نے ایک جگہ اس طرح کیا ہے :۔

ہے حیف تو یہ کہ با جمال چوں حور   عصمت اور ہووے مائل فسق و فجور
یہ وہ ہے مثل کہ عصمتی کہتے ہیں   برعکس نہند نام زنگی کافور

اے کاش نہ ہم ایسی محبت کرتے   اور کچھ کرتے تو صبر و طاقت کرتے

صاف کردہ بر طاق بلند افتادہ بود بہ سبب نم زدگی باراں از صفحۂ قوت خود نمودہ پارہ کاغذ کرم خوردہ و پارہ سلامت برآمدہ مضمون بستہ آں نظم از دست رفت

بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۲ صفحہ ۷ سے آگے :-

گر ہے یہی بیکلی تو ایک دن یا رب　　مر جاویں گے یونہی عصمت کرتے

سلاطین اودھ خود اثنا عشری عقائد رکھتے تھے۔ اس لئے عام طور پر درباری امراء اور ان کے متوسلین کا بھی یہی مسلک تھا۔ مصحفی کے بارہ میں بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ شیعہ تھے لیکن ہمارے خیال میں وہ زیادہ سے زیادہ تفضیلی کہے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک نظم میں انہوں نے اپنے مسلک کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے ؎

نہ شیعہ باش نہ سُنّی ز خود رہے بتراش　　کہ از طریق فریقین بہ گمراں باشد
اگر طریقۂ اثنا عشری قبول کنی　　ہمیشہ تیغ بہ قتل تو در میاں باشد
دگر بہ راہ جماعت قدم زنی محکم　　دلت مدام مشوش ز لاعناں باشد
شریعت نبوی حرف ایں بجا است　　کہ ہر کہ رفت دراں راہ در اماں باشد
ولے غبار ز نا اہلی کہ از میاں برخاست　　دراں غبار خود آں راہ کنوں نہاں باشد
بطون معنی قرآں کسے نمی فہمید　　مگر کسے کہ بر آں سرّ حق عیاں باشد
کلام حق پئے تعلیم گمرہاں آمد　　نہ بہر آنکہ ہدایت ز گمرہاں باشد
خدا بولائے علی می برد بہ جنت عدن　　نہ حق ز بغض عمر بر تو مہرباں باشد
ولائے حرف چہ کار آیدت عمل شرط است　　عمل بیار کہ تا گفتہ است گراں باشد
چنیں یزید و حسین اند در جہاں بسیار　　ولے کرا خبر از حال یکساں باشد

دو مقامات حریری مع شرح داشتم۔ دو جزوے لبوا ہم دادم از مولوی عنایت محمد شاگرد خود کہ قصائد عرفی از من خواندہ اند دیدہ ام و از ان کتاب محاورہ ہائے زبان عرب را اندکے دریافتہ اگر زمانہ فرصت داد باتمامش می رسانم یعنی متن قرآن را بے احتیاج تفسیر حرف بہ حرف بہ سینہ دارم، اگر کتاب ہائے عربی مثل مختصر و مطول بیک مطالعہ من آسان می شود، ہیچ مطلبے غامض نیز از فکرم در پردۂ اختفا نمی ماند۔ این نقص را کہ عربی دان نہ بودم درین شہر از خود رفع نمودم، نقص دوم ناآشنائی علم عروض و قافیہ بمطالعہ چند شبے عروض ہائے استادان گزشتہ در عرصہ قلیل بدو دانستم و خود ہم عروضے مختصر تالیف نمودم و نام آں خلاصۃ العروض

بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۲ صفحہ ۹ سے آگے۔

کہ جستجو کند ایں را کہ حق بجانب کیست — حق حسین چو از دیدہ ہا نہاں باشد
زہے سلوک معاش ار زمن سوال کنی — ہمیں متابعت رائے خسرواں باشد
گرفتم اینکہ سزاوار سروریست حسن — ولے محاویہ وقتے کہ در میاں باشد
چہ عیب ازیں کہ حسن تابعش شود چندے — کہ حق ز دیدۂ مردم کجا نہاں باشد
زبسکہ قتل حسین علی مقصد بود — ز چند کشتہ کہ بر آگہاں عیاں باشد
بہ بیعت منقبش تن نداد میدانست — کہ بیعتش سبب ذات مہاں باشد
دگر بجائے خود ایں نیز خوب می سنجند — کہ مشکل است بہ بیعت بخاک بیاں باشد
ازاں خلاف اولی الامر کام زد عمداً — کہ ناسزا بخلافت نہ حکم راں باشد
ولے خلافت عقبیٰ کجا فرو نہ دہد — خلافتے کہ حقیقت حق در آں باشد

گذاشتم، الحمد للہ کہ ہر چہ مقصود من بود حاصل شد و ایں ہر دو زبان فارسی و ہندی از ایام شباب بمثل غلام و کنیز شب و روز پیش من کمر بستند۔ قریب صد کس از میرزادہا و غریب زادہا بحلقۂ شاگردی من آمدہ باشند و فصاحت و بلاغت را از من آموختند، در محاورۂ فارسی کتاب مفید الشعرا کہ تالیف کردہ ام طفیل فارسی است، اگرچہ الحال مرا ننگ می آید از نوشتن اشعار فارسی و ہندی خود دریں جا می خواستم کہ اشعار عربی بنویسم خردم بانگ بر من زد کہ چوں نامے دریں فن بر آوردہ از نوشتن شعر عربی چہ حاصل، کہ می داند و کہ می فہمد، چوں زبان فارسی از بے علمی صاحبان زمانہ ماندہ در آفتاب اختفا دارد طبیعت ہا بیشتر متوجہ ریختہ اند دامن قبول ایں گلہائے شگفتۂ ریختن و بد ریختاں ندارد از عربی آویختن عقل صلاح اندیش رخصت نمی دہد ناچار بفحوای رائے صائب از رطب و یابس کلام فارسی و ہندی ہر چہ مناسب دیدم بہ تحریر خامۂ وقائع نگار آوردم بزیور قبول سامان سخن سنجاں مجلی و آراستہ و بحصول پذیرائی طبائع معنی دوست مجلے یاد۔ سنہ عمر تا الی الیوم قریب ہشتاد رسیدہ باشد، اکنوں دل از دیدہا بر کندہ جز یاد الٰہی معروف بودن بہ نماز روزہ چیزے دیگر نمی خواہد حق سبحانہ عاقبت بخیر کناد۔[1]

مجمع الفوائد کے دیباچہ میں بھی اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ علوم و فنون

---

[1] ریاض الفصحا، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۲۸۶ — ۲۸۸

کی تحصیل اور استادوں کے بارہ میں مصحفی نے جو کچھ ریاض الفصحا میں لکھا ہے۔ اس کی تائید مجمع الفوائد سے ہوتی ہے۔ رسالہ فارسی میں ہے لیکن قدیم دستور کے مطابق دیباچہ عربی میں ہے۔

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم و فنون اور شاعری کی تکمیل شاہجہان آباد میں ہوئی اور ان دونوں میں درجہ کمال حاصل کیا۔ عربی کی طرف سے پھر بھی اطمینان نہیں ہوا۔ چنانچہ لکھنؤ میں پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ فن عروض میں بڑی محنت سے مہارت بہم پہنچائی۔ یہاں تک کہ خود ایک رسالہ تصنیف کیا۔ تعلیم کے ابتدائی مراحل کے بارہ میں صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور امروہہ میں گزرا تھا۔ تذکرہ ہندی گویاں میں سید محمد زماں زماں کے حالات میں ضمناً اپنی ابتدائی تعلیم اور استاد کا ذکر کیا ہے۔ لیکن نام نہیں بتایا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے سراپا سخن کے حوالے سے ان کے ایک استاد امانی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ تحقیق نہیں ہوا کہ یہ امانی کون تھے اور مصحفی نے ان سے کیا حاصل کیا۔ مجمع الفوائد میں جہاں مصحفی نے اور استادوں کے نام گنائے ہیں۔ وہاں ان کا کوئی ذکر نہیں۔ نہ مصحفی نے اپنی تحریروں میں کہیں اور اس کی تفصیل لکھی ہے۔

شاہجہان آباد پہنچنے کی تاریخ کسی تذکرہ میں نہیں ملتی۔ حسرت، مولانا عبدالحی

---

[1] مقدمہ ریاض الفصحا ر ۂ

اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ لکھتے ہیں کہ عنفوان شباب میں امروہہ سے دلّی آئے۔ تذکرہ ہندی گویاں میں خود اپنے حال میں لکھتے ہیں کہ بارہ سال میں نے دلی میں گزارے ہیں۔ تذکرہ سنہ ۱۲۰۹ھ ۱۷۹۷ء میں لکھا گیا۔ اس حساب سے سنہ ۱۱۹۷ھ ۱۷۸۳ء میں یا اس کے قریب آئے ہونگے، اور اگر سنہ ولادت سنہ ۱۱۶۴ھ ۱۷۵۰ء تسلیم کر لیا جائے تو اس وقت ان کی عمر ۳۳ سال کے قریب ہوگی۔

دلّی میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ذوق شاعری کی بھی تربیت ہوتی رہی۔ چنانچہ اپنے تذکروں میں بار بار دلّی کے مشاعروں اور وہاں کی دلچسپ مجلسوں اور رنگین صحبتوں کا حال قلمبند کیا ہے۔ دلّی سے وابستگی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ مصحفی اسے اپنا وطن بتلاتے ہیں۔ ؎

دلّی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی   میں رہنے والا ہوں اُسی اُجڑے دیار کا

یہی وہ شعر ہے جسے کچھ تغیر سے میر کے لکھنؤ آنے کے سلسلہ میں ایک قطعہ کے ساتھ شامل کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

تذکرہ ہندی گویاں میں جا بجا دلّی کے مشاعروں کا حال درج ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہیں یہ رتبہ حاصل ہو گیا تھا۔ کہ لوگ ان کے شاگرد ہونے لگے تھے اسی تذکرہ میں مصحفی نے اپنا آبائی پیشہ نوکری خانہ بادشاہ لکھا۔ نیز بیان کیا ہے کہ جب سلطنت کا کارخانہ درہم برہم ہوا تو ان کی سلطنت بھی مٹ گئی اور یہ مجبوراً کسب معاش کے لئے نکلے۔ لیکن اس کی صراحت نہیں کہ پھر دلی میں کیا پیشہ اختیار کیا۔ صرف اتنا لکھتے ہیں

"دوازدہ سال در شاہجہان آباد بہ دور نواب نجف خاں ایام بگذشتہ [illegible]

گزیدہ [illegible] ریختہ اردو دے معنی کماہی دریافت نمودہ ہرگز برائے تلاش معاش دربان [illegible] بسادا مورات بردرکس نہ رفتہ"۔

اسر [illegible] ے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اپنے حریف انشا کی طرح وہ کسی نواب یا [illegible] یرزادے کے درباری شاعر نہیں تھے۔ بلکہ بقول مولوی عبدالحق[1] اپنی معا [illegible] ں اپنے دست و بازو سے کماتے تھے اور کسی کے دست نگر نہ تھے۔ تذکرہ ریا [illegible] ن الفصحا سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے امیرزادے نواب قمر رکاب ابین الدو [illegible] معین الملک عزت مرزا مینڈھو خلف نواب شجاع الدولہ جن کے دربار می [illegible] انشا، عظیم، قدرت اللہ قاسم وغیرہ موجود تھے۔ ان پر عنایت کرنے [illegible] ے مصحفی کا بیان ہے۔

"برنا [illegible] براز ابتدائے ملاقات، تا در شاہجہان آباد توجہ و مہربانی می فرمودند و در لکھ [illegible] ہم بخدمت کیمیا خاصیت ایشان میرسیم[2]"

بع [illegible] ں تذکرہ نویسوں نے انہیں تجارت پیشہ لکھا ہے۔ چنانچہ عشقی، میر حسن اور اسپر [illegible] ر کی یہی رائے ہے۔

د [illegible] یں جن لوگوں سے زیادہ اخلاص اور محبت کا تعلق تھا اُن میں میر امانی اسد [illegible] یدین خاں امین۔ ثناء اللہ خاں فراق۔ عنایت اللہ مشتاق۔ مرزا علی نقی م [illegible] ، میاں عسکری نالاں۔ میاں نصیر، مرزا محمد ہاتف، رحیم اللہ جوشش [illegible] شاہ عاقل، مرزا محسن فدوی۔ قدرت اللہ قدرت اور حسرت کا ذکر

---

[1] مقدمہ ریاض الفصحا، ج [2] ریاض الفصحا صفحہ ۳

انہوں نے خود کیا ہے۔ خواجہ میر درد کے حال میں لکھا ہے۔ "تب تک دلی میں رہا مبلے نعرضانہ حاضر ہوتا تھا۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بھی کچھ فیض پایا ہوگا۔ میر محمدی بیدار سے بھی گاہ گاہ ملاقات کا حال لکھا ہے۔ "بصحبت اشعر میاں می آمد" اسی سلسلہ میں مشہور صوفی بزرگ شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی کا بھی ذکر آتا ہے۔ ریاض الفصحا[1] میں لکھتے ہیں۔

"مولوی نیاز احمد تخلص کہ بندہ در ایام طالب علمی شان عالم دیدہ ہمت ایشاں را دیدہ بلکہ چند روز میزان ہم از ایشاں در شاہجہان آباد خواندہ بودم باقی صادر دارد، چوں طنطنۂ فصاحت من از لکھنؤ بہ گوش مبارک ایشاں رسیدہ غزلے کہ بعد تحصیل فنون فضائل خود گفتہ بودند از برائے فقیر نوشتند۔"

اس واقعہ سے مصحفی کی افتاد طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو شخص بزرگوں اور صوفیوں کی صحبت اٹھا چکا ہو اس کے یہاں مسکینیت و متانت کا پایا جانا ناممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کی خاص فضا میں رہ کر بھی ان کی شاعری ان خصوصیات میں معاصرین میں منفرد ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت آمادۂ زوال تھی۔ سیاسی انتشار کے ساتھ دولت اور اطمینان بھی ناپید ہوتے۔ وضعداری کے پاس سے شرفا اور اہل کمال اب بھی اسی خاک پاک پر جان دیتے تھے۔ انہیں اپنی گمنامی گوارا کرنا پڑتا تھا لیکن رفتہ رفتہ حالات ناقابل برداشت ہوتے گئے۔ متاع ہنر کے جوہری دلی سے رخصت ہوگئے۔ اور اہل کمال پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ مجبوراً دلی سے باہر نظر ڈالی۔ اس

---

[1] ریاض الفصحا صفحہ ۲۳۹

زمانہ میں بعض چھوٹی چھوٹی ریاستیں اپنے درباروں کو آباد کر رہی تھیں۔ اودھ، روہیل کھنڈ، فرخ آباد، مرشد آباد، دکن ارکاٹ وغیرہ، ان میں دلی والوں کے لئے سب سے قریب فرخ آباد۔ اودھ اور روہیل کھنڈ تھے۔ چنانچہ ارباب فضل و کمال نے دلّی سے رختِ سفر باندھا۔ اور اُن میں سے بیشتر اودھ پہنچے ان مہاجرین میں وہ لوگ بھی تھے۔ جن سے دلی میں اُردو شاعری کی بزم روشن تھی۔ اس مجلس کے میر سراج الدین علی خاں آرزُوؔ تھے۔ جن کے شاگردوں سے دہلوی شاعری کا رنگ نکھار پر آیا تھا۔ نواب شجاع الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ نے از راہ قدر دانی انہیں لکھنؤ بلایا۔ اور سر آنکھوں پر بٹھایا۔ خان آرزُو نے عرصہ تک اودھ میں قیام کیا۔ اور وہیں سنہ ۱۱۶۹ھ ۱۷۵۵ء میں وفات پائی۔ لیکن لاش دفن ہونے کے لئے دہلی کھنچی گئی۔ اس کے بعد شجاع الدولہ کے ہی عہد میں اشرف علی فغاںؔ اور ان کے بعد سوداؔ۔ میرؔ، میر سوزؔ بھی ترک وطن کر کے فیض آباد اور لکھنؤ پہنچے۔ اور یہیں آسودہ خاک ہوئے۔ اُن کے علاوہ مرزا جعفر علی حسرتؔ میر حیدر علی حیراںؔ، خواجہ حسن حسنؔ، مرزا فاخر مکیںؔ۔ میر ضاحکؔ۔ اور میر حسنؔ بھی یہیں چلے آئے۔ میر قمر الدین منتؔ، ضیاء الدین ضیاءؔ۔ اشرف علی خاں فغاںؔ اگرچہ آخر عمر تک لکھنؤ نہیں رہے۔ لیکن مدت تک انہوں نے قیام کیا۔ اور یہیں ان کی شاعری چمکی۔ جرأتؔ۔ انشاؔ اور مصحفیؔ بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ جو اصغر علی خاں نسیمؔ دہلوی پر ختم ہوتا ہے۔ صرف ایک میر دردؔ ایسے تھے جو آخر دم تک وضعداری اور درویشی کو نباہتے رہے۔

مصحفیؔ عرصہ تک دل کو بہلاوے دیتے رہے لیکن جب معاش کی تنگی

زیادہ ہوئی تو یہ بھی دلّی کو سلام کرکے نکلے۔ دلّی سے روانہ ہونے کا زمانہ قطعی طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن قرین قیاس ہے۔ کہ سنہ ۱۱۸۰ھ ۱۷۶۶ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے۔ دلی سے نکلے تو پہلے آنولہ پہنچے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ وہ خود نواب محمد یار خاں امیرؔ کے بیان میں لکھتے ہیں:-

"ودرایامیکہ بہ ترغیب حکیم کبیر سنبھلی شوق شعر بندی دامن دلش را بسوئے خود کشید خطے بہ طلب میر سوز و مرزا محمد رفیع نوشتہ روانہ کرد، چوں دراں ایام ایں ہر دو بزرگ در سرکار مہربان خاں رندؔ تخلص بصیغۂ شاعری عز و امتیاز داشتند از فرخ آباد آمدن ایشاں بہ ٹانڈہ کہ موضع بود باش نواب بود اتفاق نیفتاد۔ آخر کار میاں قائم کہ در آں ایام در بسولی بود حسب الارشاد آمدہ شرف ملازمت آں والا جناب دریافت و بہ ماہانہ یک صد روپیہ عز و امتیازش دادہ باستادیش بر داشت۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس دیگر سخن سنجاں مثل فدوی لاہوری و میر محمد نعیم نعیمؔ تخلص، و پروانہ علی شاہ پروانہ مراد آبادی و میاں عشرت ہزال و حکیم کبیر صاحب کہ از ندیم در سرکارش بود و فقیر حقیر مصحفیؔ از حاضران مجلس او بود۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت سوداؔ فرخ آباد میں تھے۔ اس وقت آنولہ اور ٹانڈہ میں وہ محفل جمی جس میں مصحفی بھی آکر شریک ہوئے۔ سوداؔ سنہ ۱۱۸۳ھ ۱۷۶۹ء تک فرخ آباد میں موجود تھے۔ لہٰذا قریب قریب یہی زمانہ مصحفی کے ٹانڈہ پہنچنے کا ہے۔ ٹانڈہ کا دربار اگرچہ مختصر تھا۔ لیکن دلچسپی میں پرانے شاہانہ درباروں کی یادگار تھا۔ اس کے میر مجلس نواب محمد یار خاں امیرؔ تھے۔ یہ نواب علی

محمد خاں مورث نوابان رامپور کے بیٹے اور نواب فیض اللہ خاں رئیس رامپور کے بھائی تھے۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ علم موسیقی اور ستار نوازی میں اُستاد تھے شعر و شاعری کی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ عاقل خاں مصوّر نے ان کی فرمائش پر ان کے درباری شعراء کا ایک مرقع تیار کیا تھا اس زمانہ (۱۱۸۵ھ ۱۷۷۱ء) میں شاہ عالم نے مرہٹوں کی مدد سے سکرتال کے مقام پر ضابطہ خاں کو شکست دی۔ اور مرہٹہ گردی کے باعث نواب کا دربار بھی درہم برہم ہو گیا۔ اور اُن کے بھائی نواب فیض اللہ خاں ان کو رامپور لے گئے۔ جہاں حافظ رحمت خاں روہیلہ کی شکست کے بعد ۱۱۸۸ھ ۱۷۷۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مصحفی نے اپنے تذکرہ ہندی گویاں میں جابجا یاراں آنولہ اور وہاں کی صحبت کو یاد کیا ہے۔ قائم کے بیان میں لکھتے ہیں:-

"واقعہ کہ یاد آں صحبت گزشتہ داغ ناکامی بر دل دردمندی گزارد"[۵]

اسی بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی قائم کے ذریعہ سے نواب کے یہاں ملازم ہوئے تھے اور قصیدہ پیش کیا تھا۔ اگرچہ نواب کے اشعار کی اصلاح باقاعدہ طور پر قائم کے سپرد تھی۔ لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام مصحفی بھی انجام دیتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

"کاغذہائے مسودہ اشعار نواب کہ برائے اصلاح پیش او می آمد از کم دماغی بدست ما مشورہ فقیر می داد"

---

[۵] تذکرہ ہندی گویاں صفحہ ۱۷۹

اسی سے کیٹھر کی مدت قیام کا بھی پتہ چلتا ہے۔

”چنانچہ سہ ماہ بہمیں طور یک جا گزرانیدہ ام“

آنولہ کے قیام کے سلسلہ میں علاوہ قائم کے بیجاں۔ پروانہ، حیرت، عشقی عظیم۔ فدوی۔ تمنا، کبیر اور نعیم کا ذکر بھی کیا ہے۔ قدرت اللہ شوق سنبھلی کے تذکرہ[1] سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس صحبت میں وہ بھی شریک تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی آنولہ کیٹھر کے بعض شعرا کا حال طبقات الشعراء میں لکھا ہے۔

۱۱۸۵ھ ۱۷۷۱ء کے بعد جیسا کہ جا بجا مصحفی نے خود لکھا ہے۔ نواب محمد یار خاں کے رامپور چلے جانے کے باعث مصحفی بھی تلاش معاش میں لکھنؤ پہنچے۔ نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ اور دلی سے آنے والے شعرا فیض آباد اور لکھنؤ میں جمع ہو رہے تھے۔ ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے۔ اس مرتبہ لکھنؤ میں صرف ایک سال کی قلیل مدت گزار کر دلی واپس چلے گئے۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد پھر لکھنؤ دوبارہ پہنچے۔ اور اس مرتبہ جو آئے تو یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ لکھنؤ میں پہلے چند روز لالہ کانجی مل صبا کے مکان پر قیام کیا۔ جو ان کے شاگرد بھی ہو گئے تھے۔ ان کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

”فقیر در ایامیکہ وارد این شہر بود چندے حسب اتفاق بر مکان ایشاں اقامت داشت[2]“

لکھنؤ میں جن لوگوں سے توسل رہا ان کی فہرست یہ ہے:۔

(۱) میر محمد نعیم خاں (۲) مرزا ٹیڈھو سبز (۳) قمر الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی

---

[1] تلخیص تذکرہ طبقات الشعراء مرتبہ راقم الحروف [2] ہندی گویاں صفحہ ۱۴۱

(۴) فخر الدین احمد خاں مرزا جعفر (۵) نواب کلب علی خاں بہادر (۶) مہدی علی زماں (۷) مرزا سلیمان شکوہ۔ ان میں سے ہر ایک کے بارہ میں خود مصحفی کا بیان ملاحظہ ہو

میر محمد نعیم خاں "روزے مومی الیہ (میر اکبر علی اختر) ہمراہ مرزا جانی کہ از کربلائے معلیٰ آمدہ بودند بہ لکھنؤ آمد، فقیر دراں ایام رفیق میر محمد نعیم خاں بود"[1]

مرزا بینڈھو سبز "فقیر پیش ازیں مدت چار سال بصیغہ شاعری ملازم و رفیق ایشاں ماندہ بسیار عزت دوست میداشتند"[2]

یہ تذکرہ ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء میں مرتب ہوا۔ اس حساب سے مرزا بینڈھو کی ملازمت کا زمانہ ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء کے قریب قرار پاتا ہے۔

نواب مہدی علی خاں "در سرکار دولت مدار ایشاں بعضے از صاحب کمالاں ایں فن بہ صیغہ شاعری عز امتیاز دارند در آں جملہ فقیر ہم داخل است"[3]

تذکرہ ریاض الفصحا ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء میں شروع ہو کر ۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۰ء میں ختم ہوا۔ اس حساب سے یہی زمانہ نواب مہدی علی خاں کی ملازمت کا شمار کرنا چاہیئے۔

فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر "بر حال ایں عاصی از قدیم الایام توجہ مہربانی از تہ دل داشتہ وگاہے گاہے بوقت احوال ہم پرداختہ"[4]

---

[1] ہندی گویاں صفحہ ۲۵ [2] ایضاً صفحہ ۱۱ [3] ریاض الفصحا صفحہ ۲۸-۱۳ [4] ایضاً صفحہ ۷

یہ بزرگ قمرالدین احمد خاں عرف مرزا حاجی کے والد تھے۔ اور ان کا انتقال سنہ ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۴ء میں ہوا۔ اس لئے قریب قریب یہی زمانہ ان کے ہاں ملازمت کا شمار کرنا چاہیئے۔

قمرالدین احمد خاں عرف مرزا حاجی

"چوں عاصی دریں کار اُردو دانی) زیادہ رسواست زیادہ تر بدل نزدیک ایشاں گردید"[۱]

یہ وہی مرزا حاجی ہیں جو ناسخ کے سرپرست اور مربی تھے۔ اور جن کی صحبت میں اکثر شعرا نے اپنے مذاق شعری کی تربیّت کی۔ مولانا عبدالحی گل رعنا میں ناسخ کے سلسلہ سے ان کا حال لکھتے ہیں:۔

"ان کی (مرزا حاجی) صحبت میں ان کو (ناسخ) بھی زبان کی تراش و خراش اور تحقیق و تدقیق کا چسکہ پڑا اور ان کے دن بڑھانے سے کلام نے روز بروز رنگ پکڑنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ دل میں اُمنگ اور طبیعت میں جوش بہت بڑھ گیا"

مصحفی کی ملازمت کا زمانہ ان کے یہاں سنہ ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۴ء کے بعد قرار پاتا ہے۔

نواب کلب علی خاں بہادر

"ہرگاہ دریں نزدیکی روزگار شیخ (مغل ثانی) موصوف بہ سرکار نواب کلب علی خاں بہادر رونق شرف گرفت . . . . واجب رفتن مشاعرہ بر من فرض گردید برائے آنکہ فقیر ہم در سرکار ایشاں پیش از مغل مذکور عز امتیاز داشت۔ چند سال گذشتہ باشد کہ حالا باوصف نہ رفتن فقیر بہ سبب روزگار نواب جناب مہدی علی خاں بہادر شاگرداں من آں مجلس بدستور اول قائم دارند"[۲]

ریاض الفصحا۔ [۲] ایضاً صفحہ ۲۵۔

یہ زمانہ نواب مہدی علی خاں کی ملازمت (۱۲۲۱ھ ۱۸۰۶ء تا ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۰ء تخمیناً) سے پہلے شمار کرنا چاہیے۔

مرزا سلیمان شکوہ شاہ عالم کے صاحبزادے تھے، دلی سے لکھنؤ چلے آئے تھے۔ سیاسی مصالح کی بنا پر یہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ لکھنؤ میں ان کا دربار شعراء کا مرجع تھا۔ ان کے بارہ میں مصحفی لکھتے ہیں:-

”مرشدزادہ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ سلیمان تخلص کہ محامد ذات قدسی آل مہر درخشانِ آسمانِ جلالت و ماہ فروزانِ برجِ ابہت از تحریر و تقریر اقالم والسنہ فصحاء و بلغاء مافوق است چوں بفضلِ الٰہی در جمیع فنونِ دانشمندی یگانہ روزگار اند بمقتضائے موزونیٔ طبع کہ پادشاہانِ سلف را نیز بودہ است اکثر رخشِ خیال را در میدانِ فصاحت می تازند، شعر خوب را ہر کہ باشد دوست میدارند۔ درایامیکہ حکم ترتیب مجلس مشاعرہ شدہ بود اکثرے از کارداناں ایں فن در حضور آمدہ حاضر می شدند، ایں فقیر حقیر ہم چوں نسبت دیگراں با وصف گوشہ نشینی دریں کار زیادہ رسوائی داشت بگفتہ میر انشاء اللہ خاں حسب الطلب حضور باوصف کم بغلی و شکستہ حالی شریک مجلس یاراں شدہ بود، چنانچہ در ہماں تاریخ بہ حلقہ ملازمان حضور در آمد و بعد چندے از کلام فقیر محظوظ شدہ در جائزہ قصائد مدحیہ کہ مشتمل بر تہنیت عیدین بودند بانعام بتبریک مکرر سر احقر از حضیض خاک باوج افلاک رسانیدند، و ہم چنیں قلندر بخش جرأت ہم پیش از فقیر بعد سہ چہار ماہ دولت ملازمت حضور حاصل نمودہ، بہ نوازش خسروانہ در آمدہ

و نیز نوکر شده، و میر سوز کہ کسوت درویشی بہ قامت حال خود راست داشت، در اوائل مشاعرہ بانعام یک دوشالہ و یک پیوڑ سرفرازی یافتہ راہ خود پیش گرفت، میر انشاء اللہ خاں کہ بہ نائب و مختار حضور یعنی خان صاحب و قبلہ زادہ خان بہادر کہ ایشاں در شعر فہمی و نثر نویسی نظیر خود ندارند صیغۂ اخوت خواندہ اند، ہمیشہ مورد گوناگوں الطاف خسروی می باشند چند بار بانعام لائقہ قبا و گوشوارہ سرمباہات برافراختہ اند۔ حق تعالیٰ ایں قدر شناس شعرا را کہ دریں زمانہ دوں قدر سخن با خاک یکساں شدہ بر تخت سلطنت و جہانبانی زود مسلط گرداناد و مراد دل دولت خواہاں حضور کہ شب و روز دست بر دعا دارند زود برآرد۔"

تذکرہ ہندی گویاں سنہ ۱۲۰۹ھ ۱۷۹۴ء میں مکمل ہوا۔ اس سے مولوی عبدالحق صاحب[1] کا قیاس ہے سنہ ۱۲۰۷ھ ۱۷۹۳ء میں مصحفی انشا کی وساطت سے دربار میں داخل ہوئے ہوں گے۔ سلیمان شکوہ دلّی میں حاتم کو اپنا کلام دکھاتے تھے، لکھنؤ آکر ولی اللہ محب کو اُستاد بنایا۔ ان کا انتقال سنہ ۱۲۰۷ھ ۱۷۹۳ء میں ہو گیا۔ (اس کے بعد ہی اُنہوں نے مصحفی کو اپنا کلام دکھایا ہوگا۔ لیکن صحیح تاریخ کا تعین نہیں ہو سکتا۔ مصحفی ولی اللہ محب کے انتقال کا حال لکھتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ ان کے بعد شاہزادہ نے اپنا کلام مجھے دکھانا شروع کیا۔ اس تذکرہ میں اپنے متعدد شاگردوں کا حال لکھا ہے۔ لیکن سلیمان شکوہ کو اس حلقہ میں شامل نہیں کیا ہے)

---

[1] مقدمہ تذکرہ ہندی گویاں صفحہ ہ

سلیمان شکوہ کے دربار میں مصحفی کی زندگی کا ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ یہ ان کا انشاؔ سے معرکہ ہے جو شاعری کی حد سے گذر کر فوجداری تک پہنچا انشا نے مصحفی کو سلیمان شکوہ کے دربار میں پہنچایا لیکن رفتہ رفتہ مصحفی کا رسوخ اس قدر بڑھ گیا۔ کہ انشا کو بار خاطر گذرنے لگا۔ انشا سمجھدار آدمی تھے۔ انہوں نے اس کو دل میں رکھا۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں سلیمان شکوہ کے ہاں ایک مشاعرہ ہوا۔ جس میں اس وقت کے مذاق کے مطابق عجیب غریب قوافی و ردیف کی طرح دی گئی۔ مصحفی نے بھی غزل کہی، مقطع یہ تھا۔

تھا مصحفی یہ مائل گریہ کہ پس از مرگ   تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

کسی نے اس میں تصرف کر کے یوں کر دیا ؎

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس از مرگ   تھی اسکی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

مصحفی سمجھے کہ یہ انشاؔ اور اُن کے ہواخواہوں کی حرکت ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک فخریہ غزل کہی، جس کا مطلع یہ ہے ؎

مدت سے ہوں میں سرخوش صہبائے شاعری   ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری

اسی میں یہ شعر ہے:۔

ہیں لکھنؤ میں زمزمہ سنجان شعر کو   برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری

ایک شعر میں انشاؔ کے خاندانی پیشہ طبابت کی طرف اشارہ کر کے چوٹ کی ہے:۔

اک طرفہ خر سے مجھ کو کام پڑا ہے کہ ہائے   سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

تعلی کے اشعار فارسی ملاحظہ ہوں ؎

اے مصحفی ز گوشۂ خلوت بروں خرام   خالی ست از برائے تو خود جائے شاعری
ہر سفلہ را زبان و بیانِ تو کے رسد   آخر توئی فغانی و بابائے شاعری
مجنوں منم چرا دگرے رنج می برد   در حصّۂ من آمدہ لیلائے شاعری

انشا کی طبیعت صاف تھی۔ چنانچہ بقول مولانا آزاد وہ پالکی میں سوار ہو کر مصحفی کے پاس غلط فہمی رفع کرنے گئے۔ لیکن مصحفی نے لاپروائی سے جواب دیا۔ واپس آ کر انشا نے بھی بحرِ طویل میں مصحفی کی ہجو کہہ ڈالی۔ یہ اُس مناقشہ کی ابتدا تھی۔ اس کی انتہا وہ ہوئی جس کی مثال شاید ہی اور کہیں ملے

اتفاقاً اسی زمانہ میں ایک اور مشاعرہ ہوا، قوافی اور ردیف اس میں عجیب تھے۔ شقنقور کی گردن، عور کی گردن، مصحفی نے بھی غزل کہی۔ جس کا مطلع ہے :-

سرِ مشک کا تیرا تو ہے کافور کی گردن   نے مینے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

انشا نے ایک طویل قصیدہ میں اس پر اعتراضات کئے۔ چند اشعار یہ ہیں :-

سُن لیجیے گوشِ دل سے مری مشفقانہ عرض   مانند بید غصّہ سے مت تھرتھرائیے
کیا لطف ہے کہ گردن کافور باندھ کر   مردوں کے پاس رندوں کو لا کر سنگھائیے
ایسے نجس کثیف قوافی سے نظم میں   دندانِ ریختہ پہ پھپھوندی جمائیے[1]

انشا نے خود انہیں ردیف قوافی میں غزل کہی :-

---

[1] اس میں در پردہ مصحفی پر چوٹ ہے۔ جو بقول آزاد مسّی ملا کرتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے دانت سیاہ ہو گئے تھے۔

توڑوں گا خم بادۂ انگور کی گردن　　رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن
حاسد تو ہے کیا چیز گرے قصد جو انشا　　تو توڑے جھٹ بلعم باعور کی گردن

مصحفی کب چپ رہ سکتے تھے۔ انہوں نے جواب میں ایک قطعہ لکھا۔ اور انشا کی غزل پر بہت سے اعتراض کیے ؎

کافور سے مطلب ہے مرا اس کی سفیدی　　ٹھنڈی تو میں باندھی نہیں کافور کی گردن
میں لفظ سقنقور مجرد نہیں دیکھا　　ایجاد ہے تیرا یہ سقنقور کی گردن
لنگور کو شاعر تو نہ باندھے گا غزل میں　　کس واسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن
گردن کی صراحی کے لئے وضع ہے ناداں　　بیجا ہے "خم بادۂ انگور" کی گردن
جو گردنیں میں باندھی ہیں تجھ کو دکھا دوں　　تو مجھ کو دکھا دے "شب دیجور" کی گردن

معلوم ہوتا ہے کہ ان معرکوں میں مرزا سلیمان شکوہ انشا کے طرفدار تھے چنانچہ تھوڑے دن بعد مصحفی کی تنخواہ پچیس روپیہ ماہانہ سے گھٹا کر صرف پانچ روپیہ کر دی گئی۔ مصحفی لکھتے ہیں :-

اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے　　ہم بھی کہیں دو دن میں تھے پچیس کے لائق
استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر　　ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

ان اشعار سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مصحفی اس وقت سلیمان شکوہ کے استاد تھے۔ غرض مناقشہ کی نوبت جنگ و جدل تک پہنچی۔ چنانچہ گرم اور منتظر نے جو مصحفی کے خاص شاگرد تھے۔ علاوہ اور ہجویات کے ایک مثنوی "گرم طمانچہ" لکھی۔ انشا بھی چوکنے والے نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک مثنوی لکھی، جس میں مصحفی کے ساتھ بیگناہ مصحفن کو بھی شامل کر لیا۔

ایک باقاعدہ جلوس مرتب کیا گیا۔ ایک شخص ہاتھی پر بیٹھا ایک گڈے اور گڑیا کو لڑاتا جاتا تھا اور شعر پڑھتا جاتا تھا۔ جلوس کا جواب دینے کے لئے مصحفی کے ہواخواہوں نے بھی تیاری کی لیکن کوتوال شہر نے غالباً خود مرزا سلیمان شکوہ کے اشارہ پر اسے روک دیا۔ اب مصحفی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور انہوں نے سلیمان شکوہ کے دربار کو ترک کر دیا۔ ایک شعر میں لکھتے ہیں ؎

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں   کچھ اسکے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں

رخصت ہونے سے پہلے مصحفی نے شاہزادے کے سامنے ایک قصیدہ درمعذرت اتہام انشا کے عنوان سے پیش کیا۔ جس کے آخر میں انہوں نے کہا تھا کہ اب جبکہ شاہزادہ کا مزاج بھی منحرف معلوم ہوتا ہے اس کے سوائے اور کوئی چارہ نہیں کہ نواب وزیر یعنی آصف الدولہ کے سامنے اس کا شکوہ کیا جائے۔ چنانچہ مصحفی نے ایسا ہی کیا۔ اور ایک مخمس لکھ کر آصف الدولہ کے دربار میں گزارا، سلیمان شکوہ والے قصیدہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ مسکین طبع اور فقیر منش تھے، اسی لئے انشا کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس زمانہ میں درباروں میں سازشوں کے جال پھیلے ہوئے تھے مصاحبین نے بھی انشا کا ساتھ دیا۔ قصیدہ کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں ؎

قسم بذات خدائے کہ ہے سمیع و بصیر   کہ مجھ سے حضرت شاہ میں نہیں ہوئی تقصیر
سوائے اسکے کہ حال اپنا کچھ کیا تھا عرض   وہ بطور شکایت تھی اندکے تقریر

مزاج میں یہ صفا ہے کہ کر لیا باور — کسی کے حق میں کسی نے جو کچھ کیا تقریر
مصاحب ایسے کہ گر کچھ کسی سے لغزش ہو — تو اُسکی رفع کی ہرگز نہ کر سکیں تدبیر
وگر کریں تو پھر ایسی کہ تا ر طیش و غضب — مزاج شہ میں ہو مشتعل بصد تشویر
سنا ہے ذرہ کہاں نور آفتاب کہاں — کہاں وہ سطوت شاہی کہاں غرور فقیر
مقابلہ جو برابر کا ہو تو کچھ کہیے — کہاں وہ بفتی و دیبا کہاں بلاس و حصیر
ہیں اک فقیر غریب الوطن مسافر نام — رہے ہے آٹھ پہر جسکو قوت کی تدبیر

●

یہ افترا ہے بنایا ہوا حاسد انشا کا — کہ رزم و بزم میں ہے پایۂ تخت کا وزیر

●

جو کچھ ہوا سو ہوا مصحفی اب چپ رہ — زیادہ کر نہ صداقت کا ماجرا تحریر
خدا پہ چھوڑ دے اس شہ کو وہ مالک ہے — کرے جو چاہے جو چاہا کیا بحکم قدیر

حیات مصحفی کے مصنف لکھتے ہیں کہ اس کا نتیجہ حسب دلخواہ نکلا۔ اور نواب آصف الدولہ نے انشا کو لکھنؤ سے چلے جانے کا حکم دے دیا انشا حیدرآباد کے لیے روانہ ہوگئے۔ لیکن ربیع الاول ۱۲۱۲ھ ۱۷۹۷ء میں نواب صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اور یہ پھر لکھنؤ آکر سلیمان شکوہ کے مصاحبین میں شامل ہوگئے۔ ایک اور روایت ہے کہ نواب صاحب نے ان کو خود ہی واپس بلا لیا۔ مولنا عبدالحی خازن الشعرا بواسطۂ اُردوئے معلّٰی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ حیدرآباد کے لئے روانہ ہونے کے بعد اُنھوں نے راہ میں سے شاہ محمد اجمل الہ آبادی کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا۔ اور

شاہ صاحب نے اپنے خاندانی اوراد و وظائف میں سے انشا کو کچھ بتایا۔ اور چند دنوں کے بعد نواب وزیر نے خود لکھنؤ بلوا لیا۔ معلوم نہیں بعد میں ان کے تعلقات کیسے رہے، لیکن سنہ ۱۲۲۲ھ ۱۸۰۷ء میں انشا اللہ خاں دریائے لطافت میں میر غفر غلیبی کی زبانی لکھتے ہیں:-

"اور وہ دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور نہیں رکھتے، اگر پوچھیے کہ ضرب زید عمر کی ترکیب ذرا بیان کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں"

انشا کی وفات سنہ ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۷ء میں ہو گئی، مصحفی انہیں یاد کر کے رنج کرتے ہیں:- ؎

مصحفی کس زندگی پر بھلا میں شاد ہوں   یاد ہے مرگِ قتیل و مردنِ انشا مجھے

ان واقعات نے مصحفی کی طبیعت پر جو اثر ڈالا۔ اس کا ذکر ریاض الفصحاء (سنہ ۱۲۱۴ھ ۱۷۹۹ء) کی تمہید میں اس طرح کرتے ہیں:-

"اما بعد می گوید فقیر حقیر غلام ہمدانی مصحفی تخلص کہ پیش ازیں چند سال زمانہ بود کہ من مسکین از بیدادی دوستاں زبانی زبان نطق بکام کشیدہ بگوشہ عزلت و قناعت گلیم سیہ بختی بر دوش افگندہ گمنام وار بسر می بردم و ترک شعر و شاعراں و ملاقات امیراں تبرا می کردم و وحشی وار ازیں قدم می رسیدم تا ایں کہ نظم طبیعت مرا اندک باز رام کردن گرفت و بسبب سلسلہ جنبانی سخن گردید بایں طریق کہ روزے شیخ محمد عیسیٰ تنہا تخلص آمدہ عرض کرد کہ اے قبلہ اگر برائے مشق ما مردم صحبت جلسہ انعقاد دادہ شود اغلب کہ در رائے شریف ہم اولی و انسب

باشد۔ التماس ایشاں را پذیرا کردہ در ویرانہ بیرون شہر کہ مسکن آرامی گوئید باین مسکن دلے خالی میکردیم و شریک جلسہ غیر شاگردان دیگر کسے کم نشد، چون مرا آن روزہا تعطیل محض بود این شغل را بپاس خاطر دوستان در پیش گرفتم۔"

آگے چل کر اسی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب مرزا محمد تقی خاں بہادر ہوسؔ نے آخر زمانہ تک ان کی سرپرستی کی، چنانچہ ۱۲۲۱ھ ۱۸۰۶ء میں لکھتے ہیں:-

"از ہماں روز عرصہ چار سال گزشتہ باشد کہ ملازم و رفیق ایشانم مرا باستادی بر داشتہ ہمیشہ مشورہ سخن از من میگیرند و آنچہ مقسوم من است از دست عطائے مہربانی ایشاں می رسد۔"

لکھنؤ کے اور حالات اور واقعات بھی اپنے تذکروں میں لکھے ہیں چنانچہ اپنے آنے کے متعلق راجہ جسونت سنگھ عرف کاکاجی پسر راجہ بینی بہادر متخلص بہ پروانہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:-

"در روزہائے کہ مؤلف از شاہجہان آباد بہ لکھنؤ رسید چوں غائبانہ ہمیشہ مشتاق ملاقات می ماند خبر آمدن این خاکسار شنیدہ بسیار بہ گرمی و تپاک پیش آمدہ و از ہماں ایام بلطف عنان فکر شعر فارسی بطرف ریختہ کردہ خود را شب و روز بہ گفتن شعر ہندی مصروف داشت تا الی الیوم کہ عرصہ دوازدہ سال شدہ باشد بمشق او بسیار درس و پختہ گردیدہ[لہ]"

[لہ] تذکرہ ہندی گویاں صفحہ ۲۴۶

تذکرہ سنہ ۱۲۰۹ھ ۱۷۹۴ء میں مرتب ہوا۔ اس بیان سے لکھنؤ آنے کا زمانہ سنہ ۱۱۹۷ھ ۱۷۸۲ء کے قریب ہوتا ہے۔ ابتدائی قیام کے زمانہ میں اور جن لوگوں نے مصحفی کے ساتھ سلوک کیا ہے۔ ان میں راجہ ٹیکا رام تسلی بھی ہیں، انکے حال میں مصحفی لکھتے ہیں۔ کہ میں نے ایک دیوان فارسی اور دو دیوان ہندی معہ اپنے تذکرہ فارسی یعنی عقد ثریا لکھ کر ان کو دیئے۔ اور جس زمانہ میں اس شہر میں تازہ وارد تھا۔ آدمی بھیجکر میرا دیوان اول طلب کیا۔ اور خود نقل کر لیا۔ فارسی میں تاخر تخلص سے اور اُردو میں مجھ سے اصلاح لیتے ہیں۔ آخر میں لکھتے ہیں :-

"غرض کہ با ہمہ خوبی ہا کہ دارد اخلاق ایشاں بر زبان کردمہ جاری است چنانچہ فقیر ہمہ وقت آں جملہ مرہون حسن سلوک ایں بلند اقبال است"

شاعروں میں جن دوستوں کا ذکر کیا ہے۔ اُن میں سب سے مشہور نام میر حسن صاحب مثنوی سحر البیان کا ہے ان کے متعلق لکھتے ہیں[1] :-

"تا زندہ بود با فقیر رابطہ دوستی درست داشت"

ان کی دوستی کے خلوص کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ باوجود اس قادر الکلامی اور شاعرانہ کمال کے جو میر حسن کی شاعری میں ہر جگہ نمایاں ہے انہوں نے اپنے بیٹے میر خلیق کو شاگردی کے لئے مصحفی کے پاس بھیجا۔ اور شاعری کی وہ خاص روایت جو لکھنؤ کے عام رنگ سے مختلف تھی۔ مصحفی سے لے کر خلیق کے واسطہ سے انیس تک پہنچی۔ اس نے لکھنؤ کی شاعری اور اہل مذاق کے ذوق کی بڑی حد تک اصلاح کی، مصحفی میر حسن

---

[1] تذکرہ ہندی گویاں صفحہ ۶۹

کی تعریف کرتے ہوئے ان کے کلام کے بارہ میں لکھتے ہیں

"قطع نظر از بلاغت شاعری زبانش بسیار بامزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ۔"

یہیں نواب محمد خاں رند سے بھی ملاقات رہی چنانچہ ایک ملاقات کا حال لکھتے ہیں:-

"اتفاق روزے برائے دیدن آں بزرگ ہمراہ مرزا قتیل در رستم نگر برمکانش گزر افگندہ بود مخرج زبان ہم درست نداشت ...... اگرچہ شخص جاہل بود اما سلیقہ صحبت شعرا او را ہم بہ عرصہ قلیل بہ مرتبہ والائے شاعری رسانیدہ۔"

نواب شمس الدولہ قسمت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:-

"بقریب ملازمت این خاکسار بے مقدار بجناب مرشد زادہ آفاق زبان سحر بیان ایشاں شدہ بود وعدہ روز عید داشتند۔ چوں بہ سبب کثرت ازدحام صغیر و کبیر موقع خواندن قصیدہ ندیدند برائے پاس خاطر من قطعہ مختصر تہنیت عید کہ نیز در آستیں داشتم آں را گرفتہ وصف او را و غیر ہم نگاشتہ بدست شاہزادہ دادند و مرا روبرو کردند غرض کہ محسن فقیر اند۔"

گویا سلیمان شکوہ کے دربار میں تعارف اور ملازمت کرانے میں انکی کوشش بھی شامل تھی۔ لکھنؤ میں ہی نواب الٰہی بخش معروف سے ملاقات ہوئی۔ اگر اس ملاقات کی مدت صرف چند ماہ ہے۔

لکھنؤ میں ایک مرتبہ مجلس مشاعرہ قائم ہوئی۔ اس کی ابتدا شیخ مغل

نے کی تھی۔ اور اس میں اُردو فارسی نثر نگار، منشی اور پرچہ نویس جن میں اکثر ہندو تھے شامل ہوتے تھے۔ اپنی شرکت کا حال مصحفی لکھتے ہیں:-

”حسب اتفاق روزے گذر فقیر دراں مقام افتاد۔ برائے شریک شدن۔ منشیان انشا پرداز آں روز ہا نثریکہ، در صفت دوکان تنبولی بہ تتبع ظہوری گفتہ بودم بعرض بیان آوردم چوں - خار خار مشاعرہ از قدیم در دلش جا داشت فقیر گاہ گاہ رفت و آمدی می کرد۔ القصہ رفتہ رفتہ مجلس مناثرہ بمشاعرہ تبدیل یافت“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی لکھنؤ میں صرف شاعری کا چرچہ تفریح طبع کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ لوگ طرح طرح کی علمی اور ادبی مجلسوں کے انعقاد میں دلچسپی لیتے تھے۔ یہ اور بات ہے۔ کہ اکثر کاملان فن سخنور بھی تھے۔ اس لئے ان محفلوں میں مشاعروں کا رنگ آجاتا ہے۔

غرض لکھنؤ میں مصحفی نے اپنا ابتدائی زمانہ رنگین مجلسوں اور شعر خوانی کی پُر لطف محفلوں میں گزارا۔ لیکن آخر عمر میں بڑی عسرت اور تنگدستی سے بسر ہوئی۔ شاگردوں کی مدد اور غزلوں کی قیمت پر گزارہ کرتے تھے۔ اسی عالم میں ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۵ء میں انتقال ہوا۔ اگرچہ شعرائے دہلی سب بڑی بڑی آرزوئیں لیکر لکھنؤ گئے تھے۔ لیکن ان میں سے بیشتر کا انجام عسرت و فلاکت پر ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں لکھنؤ میں فضل و کمال سے زیادہ ہنگامہ آرائی کی قدر تھی اور جو لوگ ہنگاموں میں پیش پیش نہ رہتے تھے وہ صف اول سے پیچھے ہٹا دیئے جاتے تھے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں جو مصحفی جیسے مسکین نہاد اور

درویش منش انسان کا یہ انجام ہوا لیکن وہ دربار اور ان کے ہنگامے وقت آنے پر مٹ گئے۔ مصحفی کا کلام اب بھی زندہ ہے۔ اور جب تک اُردو زبان باقی ہے۔ یہ بھی ترو تازہ رہیگا

کلام پر رائے

مصحفی صرف شاعر نہ تھے علمی پایہ کے ناقد بھی تھے چنانچہ ان کے اُردو اور فارسی شعرا کے تذکرے اس کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ میرؔ۔ قائمؔ۔ میر حسنؔ۔ شفیقؔ اور دوسرے شعراء نے بھی تذکرے لکھے ہیں۔ لیکن صرف ایک ایک تذکرہ ان سب سے یادگار ہے۔ مصحفی کے تینوں تذکرے مل کر اپنی مجموعی ضخامت اور اہمیت کے اعتبار سے ان پر بھاری ہیں۔ علاوہ ان تذکروں کے ان کی بعض اور تحریروں سے بھی ان کی شعر و شاعری کے بارہ میں رائے کا اندازہ ہوتا ہے اس لئے خود ان کے کلام پر تبصرہ کرنے سے پہلے ان کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

سب سے پہلے مصحفی نے موزوں گوئی اور شاعری میں ایک خاص نازک فرق کو محسوس کیا ہے۔ چنانچہ اپنے تذکروں میں بعض لوگوں کے حال میں لکھتے ہیں کہ محض مقتضائے موزونیٔ طبع کلام موزوں کر لیتے ہیں۔ اس فہرست میں نواب مرزا مینڈھو عبیرؔ۔ نواب اللہ علی خاں امدادؔ۔ نواب مرزا محمد نقی ترقیؔ نواب رشید الدولہ، نواب قمر الدین، مرزا حاجی قمرؔ وغیرہ شامل ہیں۔ شاعر کے لئے اس موزونیٔ طبع کے علاوہ اُستاد کی صحبت، محنت اور مشق۔ متانت۔ زبان اور محاورہ کی صحت کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ تذکرہ ہندی میں مرزا احمد علی احسنؔ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں[1]

---

[1] تذکرہ ہندی گویاں صفحہ ۱۷

"شعر خود را در اوائل فکر سخن از نظر میر ضیاء می گذرانید، بعد ازاں از خدمت مرزا رفیع استفادہ گرفتہ قوت شاعری چنانکہ شاعر را باید در قصیدہ وغیرہ پیدا کرد . . . شعر را بہ متانت و رزانت تمام می گوید و احتیاط محاورہ و صحت زبان بسیار می کند"

ولی کے بعد شمالی ہند میں ریختہ گو شعراء کو ایہام گوئی کا خاص طور پر شوق ہوگیا۔ چنانچہ شاہ مبارک آبرو۔ مضمون۔ شاکر۔ ناجی۔ یکرنگ اور ان کے معاصرین نے اپنی زیادہ توجہ ایہام گوئی پر صرف کی اور شاعری کو جس کا پہلا مقصد جذبات کی ترجمانی ہے۔ ایک صنعت گری بنا دیا۔ لیکن بہت جلد شاہ حاتم مرزا مظہر جانجاناں اور سراج الدین علی خاں آرزو کی کوششوں سے یہ سیلاب کچھ رک گیا۔ البتہ اس کے تھوڑے سے اثرات بعد تک پہنچے، مصحفی خود ایہام گوئی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور نہ ایہام گو شعرا کی تعریف کرتے تھے۔ اکبر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"فقیر اشعار ایہام را دوست نمی دارد۔"[1]

شاہ حاتم نے جس طرح ایہام گوئی کو ترک کیا اس کے بارہ میں لکھتے ہیں

"روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دوم فردوس آرام گاہ دیوان ولی در شاہجہاں آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ، با دو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد بنائے شعر ہندی را بہ ایہام گوئی نہادہ داد معنی یابی و تلاش مضمون تازہ می دادیم . . . غرض کہ از شعرائے متقدمین است در ایامیکہ فقیر در شاہجہاں آباد طرح مشاعرہ

---

[1] تذکرہ ہندی گویاں صفحہ ۲۳

انداختہ اکثر بعد مغرب در مشاعرہ قدم رنجہ می فرمود و در مجلس نشستہ زمانہ سابق خود را می ستود۔ الحال کہ در دورۂ ما زبان ریختہ بسیار بہ پاکیزگی و عمدگی رسیدہ مشارٌ الیہ ہم مرتبہ سخن تازہ گویاں فہمیدہ دیوان قدیم خود را از طاق دل انگندہ دیوان جدید بزبان ریختہ گویاں حال ترتیب دادہ "[1]

اس زمانہ کے شاعر زبان اور محاورہ کی صحت کلیس قدر خیال رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ لالہ بال مکند حضور کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔

" نقل است کہ روزے در شاہجہان آباد بخانہ لطف علی خاں ناطق مشاعرہ بود، غزل طرحی میر صاحب کہ ردیفش بعد قافیہ "اندر" بمعنی طرف تقرر داشت و ازیں جہت بعضے از فصحا اورا خلاف اردو شمردہ پیرویش نکردند و اکثرے بہ اطاعت استاد پیش کردہ اشہب فکر را در میدان خیال دوانیدہ "[2]

اسی وجہ سے وہ شعرا جو زبان کی فصاحت اور بلاغت کے نکات کے بخوبی واقف ہوتے تھے۔ ان کا کلام بھی زیادہ معتبر اور مستند سمجھا جاتا تھا میر محمد حسین منشی تخلص مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں منشی کے عہدہ پر مامور تھے ان کے بارہ میں لکھتے ہیں :۔

" از آنجا کہ بہ سبب درستی سلیقہ نظم و نثر و آگاہی فصاحت زبان اردوئے معلیٰ صرافت سخن ہم ادا می تواں گفت۔

ان کے مقابلہ میں لالہ کندن سین مضطر ہیں۔ کہ :۔

---

[1] تذکرہ ہندی گویاں صفحہ ۱ ، [2] ایضاً صفحہ ۴۴ ؎

"در طبیعتش روانی بسیار معلوم می شود اما از بے اطلاعی طرز شعر و محاورہ زبان ناچار است اگر چندے مشق سخن بہ سلیقہ شاعری خواہد کرد البتہ بجائے خواہد رسید"[1]

اُردو شاعری پر فارسی شاعری اور فارسی شعراء کا جو اثر ہوا تھا۔ اس کا ذکر مصحفی نے بار بار اپنے تذکروں میں کیا ہے۔ مثلاً صغیر علی مروت کے بارہ میں لکھتے ہیں:-

"گاہ گاہے کہ فکر شعر می کند در آں تلاش معنی ہائے تازہ منظور می دارد و اکثر غرضش تمہید طور است و یک دو قصیدہ کہ گفتہ خیال بندی را داد بطور سلیم دستے دادہ و دریں کار رو بہ مرزا فصیح پیش نہاد خاطر اوست"[2]

اسی طرح شیخ محمد بخش واجد کے بارہ میں کہتے ہیں کہ "شعرش علی الرسم زمانہ بود آخر بطور شوکت بخاری سمند خیالش بہ طرف معنی بندی و نازک خیالی عطف عناں بودہ"

تذکروں کے علاوہ مصحفی کی تصانیف میں ایک مجموعہ "مجمع الفوائد" کے نام سے ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس بارہ میں خود تمہید میں لکھتے ہیں۔

"ہر چہ از تصنیفات من ناتمام ماندہ بود چہ نظم و چہ نثر چہ عربی و چہ فارسی دریں جلد آخر در آوردہ ایں کتاب را بمجمع الفوائد موسوم ساختم"

اس کی ایک فصل میں لکھتے ہیں[3]

---

[1] تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۱۲۴ [2] ایضاً صفحہ ۲۴۵ [3] قلمی نسخہ کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی صفحہ ۳۲۶

"بدانکه محسنات شعر و منهیات شعر بسیار است شاعر را باید که از همه آگاه باشد۔ اوّل بیان محسنات می کنم و آں ترکیب و ترتیب حروف و الفاظ است بطریقے که از مصاریع و ابیات معنی بے تکلف جلوۂ ظهور دهد و سامع را در تردّد و تامل نه انگند حسن اول این است که گفتم، حسن دوم کذب محض نباشد بلکه راست . . . (؟) باشد، حسن سوم مبالغه نه غلو چهارم غلو امّا در مقام مدح صرف باید کرد نه در غزل، پنجم ملاحظه تقدیم و تاخیر الفاظ کردن در عبارت ششم تسویه حروف در مقدار، هفتم اختراع طرز و طور، هشتم پاس فصاحت و بلاغت، نهم معنی نو بستن، دهم معنی کهنه را لباس الفاظ پوشانیدن که نو نماید و شناخته نشود، یازدهم از سرقه و توارد حتی المقدور پرهیز نمودن و اگر بلا قصد اتفاق افتد در شعرے از بلند همتی بر آں هم خط نسخ کشیدن، دوازدهم محل اعتراض در نظم خالی نداشتن حتی که نسخه هم بر حاشیه خود نوشتن خواه غالب باشد خواه مساوی فافهم ذکر منهیات شعر اول غرابت و آں کلمه بود که بسمع و یاد کم رسیده باشد در شعر چنیں کلمه نباید آورد، دوم تنافر و آں حروف باشند که سامع را از شنیدن آں نفرت آید و بر زبان ثقیل نماید، سیم تعقید و آں پیچیست که شاعر در شعر دهد و مدرکه از فهم آں عاجز آید، اینهم نباید کرد، چهارم تقدیم و تاخیر کلمات که بسیار معیوب است و ضعف تالیف و شده معیوب خود دیگر از الفاظ و توالی اضافات و غیر ذالک فصل در اقسام شعرا، نازک بند، خیال بند، ادا بند، مثال بند، حال گو، معامله گو، قصه گو، افسانه گو، رنگین گو، در مختصر المعانی هم زیاده بریں نخواهی یافت، اگر عربی خوانده اورا ملاحظه کن۔"

ان بیانات کے علاوہ خود مصحفی کے اشعار اُن کے شاعرانہ مسلک پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں مثلاً ایک نعتیہ قصیدے میں لکھتے ہیں :-

بعضوں کو گماں یہ ہے کہ ہم اہلِ زباں ہیں　　دلّی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں
پھر تس پہ ستم اور یہ دیکھو کہ عروضی　　کہتے ہیں سدا آپ کو اور لاف گزاں ہیں
سیفی کے رسالے پہ بنا ان کی ہے ساری　　سو اُسکو بھی گھر بیٹھے وہ آپ ہی نگراں ہیں
ایک ڈیڑھ ورق پڑھ کے وہ جامی کا رسالہ　　کرتے ہیں گھمنڈ اپنا کہ ہم قافیہ داں ہیں
نہ حرف جو وہ قافیہ کے لگتے ہیں کہتے　　دانا جو اُنہیں سنتے ہیں یہ کہتے ہیں ہاں ہیں
تعقید سے واقف نہ تنافر سے ہیں آگاہ　　نُہ حرف بھی قافیہ کے وردِ زباں ہیں
کرتے ہیں کبھی ذکر وہ ایطائے خفی کا　　ایطائے جلی سے کبھی پھر حرف زناں ہیں
ال تو ہے کیا شعر میں اِن باتوں سے حاصل　　بالغرض جو کچھ ہے بھی تو یہ سب پہ عیاں ہیں
حاصل ہے زمانہ میں جنہیں نظمِ طبیعی　　نظم اُن کی کے اشعار یہ از آبِ رواں ہیں
پروا اُنہیں کب ہے ردیف اور روی کی　　کب قافیہ کی قید میں آتش نفساں ہیں
مجھ کو بھی عروض آتی ہے نہ قافیہ چنداں　　اک شعر سے گردیدہ میرے پیر و جواں ہیں
سو کیوں نہ ہوں، ہوں میں بھی تو ایسے کا ثناخواں　　جس کے لئے مخلوق یہ سب کون و مکاں ہیں
ماہِ عرب امی لقب اعنی کہ محمدؐ　　نت جسکی طرف دیدۂ انجم نگراں ہیں[1]

پچھلی صدی میں جب قافیہ، ردیف، عروض، ایطائے خفی، ایطائے جلی اور ایسی قسم کی دوسری بندشیں شاعروں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھیں۔ اور ان مسلمہ اصولوں سے انحراف کسی شاعر کے لئے نہ آسان تھا نہ ممکن

---

[1] کلیات مصحفی قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری صفحہ ۳۰۴ :-

مصحفی کا یہ کہنا کہ جن لوگوں کو فطرت نے شاعر پیدا کیا ہے وہ انکی پابندی سے آزاد ہیں کس قدر جیبد بات معلوم ہوتی ہے۔ اصل شاعری کے لئے تو ان میں سے کسی کی بھی قید یا پابندی نہیں۔ ہاں ایک بات "دلی دیکھنے" پر مصحفی نے خاص زور دیا ہے۔ دلی دیکھنے سے ایک طرف تو زبان دہلوی کے حاصل کرنے کی اہمیت پر زور ہے اور دوسری طرف اس انداز کی شاعری پر بھی جو دلی میں پروان چڑھی اور جس نے لکھنؤ پہنچکر ایک نیا انداز اختیار کر لیا۔ مصحفی کے اپنے کلام میں بھی یہ دونوں عناصر شامل ہیں البتہ لکھنؤ کے طویل قیام، مختلف درباروں سے توسل اور نئے لکھنوی انداز سخن کے اثرات بھی کہیں کہیں راہ پا گئے ہیں۔

ایک اور قصیدہ منقبت حضرت علی میں لکھتے ہیں:- ؎

گر فیض سخن ہو چمن آرائے طبیعت — تو گل کو دکھا دوں میں تماشائے طبیعت
میں مدح کروں اپنی تو کچھ غم نہیں اُس کا — پر مجھ سے کبھی ہجو نہ کہوائے طبیعت
کس واسطے یہ شیوہ ہے مذموم اکابر — ہوتا ہے سخن موجب ایذائے طبیعت
شاعر کو یہ لازم ہے کہ گر شعر بھی لکھے — جز مدح کے ہرگز نہ کہیں لائے طبیعت

ایک اور قصیدہ ہے۔ جسے قصیدہ شہر آشوب کہنا زیادہ مناسب ہے۔ شروع میں لکھتے ہیں:-

؏ دعوے ہو جسے شعر کا آوے نہ کہاں

اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:- ؎

سودا کہ نہیں کہتے ہیں تھا شاعر مغلق — سو شاعری اُسکی بھی بلیغوں پہ عیاں ہے
مضمون و معانی سے نہیں بہرہ کچھ اس کو — سچ پوچھو تو اُردو کی فقط صاف زباں ہے
سو اُس میں بھی تو غور سے دیکھے تو بہت جا — معنی ستم لفظ سے فریاد کناں ہے

پر مجھ کو مناسب نہیں اس بات کا کہنا سودا کے تئیں جو کہوں ہیں یہ میرا واں ہے
کس واسطے گزرا ہے وہ مقبول طبائع ویسا بھی اگر ڈھونڈے کوئی اب تو کہاں ہے
جو میر ہے سو یہ تو کبھی ہجو و قصیدہ کہتا نہیں ہرگز کہ مشیخت کا زباں ہے
ہوتی ہے غزل سے ہی عیاں شاعری اُس کی جیتا رکھے اللہ عجب سحر بیاں ہے
سچ پوچھو جو مجھ سے ہے انہیں لوگوں کی دولت یہ ریختہ گوئی کی جو دلی میں زباں ہے
سودا ہی ہر ایک شخص سے یہاں سینہ سپر تھا یہ حملہ اوٹھائے یہ کسے تاب و تواں ہے
پر جب تئیں میری بھی زباں تر ہے زباں سے ہرگز نہ کہوں گلشن معنی میں خزاں ہے
ایک ہجو کے کہنے میں زباں میری ہے قاصر ورنہ جو قصیدہ ہے میرا کوہ گراں ہے
سو اس کی فصاحت جو شناسائے سخن ہیں محتاج یہ تقریر نہیں اُن پہ عیاں ہے
کچھ اتنا برا کام نہیں ہجو کا کہنا لیکن کوئی ہو سکے بھی قابل سد کہاں ہے ۱؎

انشا اور مصحفی کے معرکے کا کچھ حال مذکور ہوا۔ غالباً اسی ماحول سے متاثر ہو کر حسب ذیل اشعار لکھے گئے تھے۔ ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی شاعری کے کس انداز کو پسند کرتے تھے۔ اور لکھنؤ میں ہوا کا رُخ کس طرف کو تھا، ؎

کیا چھپکے اب فقط میرے نالے کی شاعری اس عہد میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری
سامان جسطرح کا ہو لڑنے کا جن کے پاس ہے آجکل اُنہیں کے مسالے کی شاعری
شاعر رسالہ دار نہ دیکھے نہ ہیں سُنے ایجاد ہے انہیں کا رسالے کی شاعری
مرد گلیم پوش کو یہاں پوچھتا ہے کون گر گرم ہے تو شال دوشالے کی شاعری
یوں شعر گرم گرم پڑھے جاتے یوں نہیں منہ پونچتی ہے گرم نوالے کی شاعری

۱؎ قلمی نسخہ کلیات مصحفی پنجاب یونیورسٹی لائبریری صفحہ ۴۲۳۶

دیوان جن کے کفش سے افزوں نہیں ذرا　　کرتے ہیں کیا وہ لوگ کسانے کی شاعری
جوتی کے کاغذوں پہ چڑھاتے ہیں اپنے شعر　　یعنی کہ آرہی ہے دِوالے کی شاعری
بعضوں نے تب تو شعر پہ حسرت سے یوں کہا　　کیا دال موٹھ بیچنے والوں کی شاعری
کیسا ہی بڑھ چلے وہ کلام شریف پر　　سرسبز ہووے گی نہ رذالے کی شاعری
اہل مصحفیؔ ہیں تاجر ملک سخن کہ ہے　　خسرو کی طرح ہے یہاں ... کی شاعری

یوں بظاہر مصحفیؔ اِن نئے شاعرانہ ماحول سے بیزار نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ نقار خانے میں طوطی کی آواز بلند کر رہے تھے اور خود نامعلوم طور پر یا شاید مصلحتاً اور ضرورتاً کبھی کبھی انہیں لوگوں کی ہمنوائی بھی کر لیتے تھے جنہیں وہ بالکل پسند نہ کرتے تھے۔ ایسے عناصر کا تجزیہ آگے آتا ہے۔

اب ایک اور اہم پہلو کا جائزہ لیجئے۔ یہ مصحفیؔ کی شاعری کا نفسیاتی پس منظر ہے۔ اس سلسلے میں پہلے اس قسم کے کلام کا مطالعہ کیجئے:۔

تُلتا ہیں اُس کے پلہ میں ہوتا گر انوری　　مرزاؔ، میرؔ سے تجھے کیا ہے برابری
شانے پہ میرے مُہر نبوت نہیں، نہیں　　کرتا میں صاف دعوئ وحی و پیغمبری
انصاف کرئے میرے کلام نفیس کو　　حاصل جہاں میں یاں جس سے ہے مجھ کو یہ اشعری
کہیئے جو معجزہ تو ہے عیسےٰ کا معجزہ　　کیجے قیاس سحر تو ہے سحر سامری
تو یہ میں کیا کہوں ہوں گیا کس طرف خیال　　کیسا کمال شعر کہاں کی سخن وری
شعر و سخن ذلیل ہے ایسا کہ ان دنوں　　ہر ایک کور و کر کو ہے دعوائے شاعری
ہر بے بصر جو شعر کا دعوےٰ کرے تو پھر　　نرگس کا کیا گنہ جو ہے ہوس یہ عبہری
لیکن میں اس پہ کچھ نہیں کرتا مفاخرت　　گر فخر ہے تو وہ کہ سلیمان کی چاکری

رکھتا ہے تو جہاں میں گر اقبالِ سنجری ہیں شاعروں میں ہوں نہ ترے شاعر یہ انوری[1]
گر ایک مرغِ کہن نغمہ ہو گیا خاموش ترانہ زن ہوا گلشن میں اور تازہ صفیر
یہ کارخانہ معطل کبھی نہیں رہتا ہمیشہ کام میں اپنے ہے دورِ چرخ اسیر
ہزار حیف کہ دُنیا سے چل بسے سب یار نہ سوز و تاباں و سودا رہا نہ درد نہ میر
خدا رکھے تجھے اے مصحفی کہ اب تو ہے عوض سبھوں کے نوا سنجِ گلشنِ تقریر
غلط کیا ہیں فقط تجھے وہ مرد ریختہ گو ہیں تیری فارسی کے بھی مقر صغیر و کبیر
ترا کلام کہاں اور کہاں وہ ریختہ گو وہ شکلِ خوشۂ پرویں تو شکلِ بدرِ منیر
سوائے اس کے اگر نثر تو لکھے اُس میں بہ از وحید و ابو الفضل ہو تری تحریر
کچھ ایک علم میں منطق کے ہی نہیں تجھے دخل کہ ہے تصور و تصدیق کا تو تجربہ کبیر
اصولِ علمِ ریاضی میں گو نہ ہو وہ کمال کہ تجھ کو کہتے تفضل حسین خاں کا نظیر
بقدرِ حال ہے ہر فن میں تجھ کو درک درست جو قدرداں نہ ملے اس میں کیا تری تقصیر
زمانہ عصر میں لایا ہے تجھ سا جامع کم عجب نہیں جو تری خاکِ تن ہو سب اکسیر[2]
یہ چاہتی ہے طبیعت بحکمِ ربِ قدیر کہ ریختہ کی زمینِ سخن میں ہو تعمیر
دکھاوے ناطقہ خوبی زبانِ اُردو کی قلم معانیِ نازک ز مو کرے تحریر
نہ پہنچے جس کے تئیں نقشِ خامۂ سودا نہ پا سکے لب و لہجہ کو جس کے دعوائے میر
اگرچہ فارسی گوئی ہے میری مشقِ نخست زبانِ ریختہ کو جان دوں میں تصویر
مصورِ دو قلم ہوں میں حسنِ معنی کا ہے طبع زاد میرا نقشہ صغیر و کبیر

---

[1] قصیدہ در مدح سلیمان شکوہ کلیات صفحہ ۴۳۱ و ۴۳۲ [2] مدح کلب علی خاں صفحہ ۳۹۶

غزل کی طرز میں سعدی پہ حرف ہے مجھ کو
قصیدہ گوئی میں ہوں رشک نقش کلک ظہیر
ہے میرے شعر کا مشتاق اصفہاں میں ضیا
ہے میری نظم کا جویندہ بیلقاں میں مجیر
جو سادہ گوئی پہ آؤں تو ہوں فصیحی وقت
جو معنی بندی پہ جاؤں تو ہوں جلال اسیر
میں صدر بزم سخن ہوں کہ اہل سعی ہیں
میرے کلام سے ہے بیشتر میری توقیر[1]

•

ہو چکا دور میر اور میرزا
اب زمانے میں ہے میرا دورا
درد کو شاعروں میں کیا کہیئے
کیوں کہ ہے دور خواجہ کا رتبا
ہیں وہ بالا نشیں مسند فقیر
ان کا کب اس طرف خیال رہا
بس وہ ہی عالم ربانی ہیں
بیش و کم ریختہ کہا سو کہا
فقر میں نقش انھوں نے مارا تھا
نقشبندیہ تھا مقام ان کا
اک مشائخ سے دینی نسبت شعر
اپنے نزدیک ہے یہ پر بیجا
شاعری کے تئیں تو کیا جانے
تو نے رنج سخن نہیں دیکھا
پوچھ مجھ سے کہ میں نے اپنی عمر
دی ہے سب فن شاعری میں گنوا
دلی کے سب مشاعرے دیکھے
اور ہم طرح میر کا میں رہا
... کب جب سے اٹھ گئی ہمت
اپنے ہاں بھی مشاعرا میں کیا
مجھ سے دبتے رہے بڑے چھوٹے
میں کسی سے وہاں کبھی نہ دبا
گرچہ سب کی زباں تھی تیغ تیز
ایک منہ پہ میرے کوئی نہ چڑھا
میں نے از بس کہا سخن کو لطیف
سب نے اس کو باشتیاق سنا

---

[1] مدح میر فضل علی صفحہ ۴۰۰

جس جگہ ہے میری رسائی فکر   واں خیال مہندساں نہ گیا
جھونٹھ بولوں تو یہ زباں ہو لال   جھونٹھ کرتا نہیں میں کچھ دعوا
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے   دیکھ لے یاروں کا بھی یہ نقشا
ہے قصیدے سے تا غزل جو ضع   شعر کہنے کی ہو مدح و ہجا
کلک جادو بیاں سے اپنے   دیکھ تو کس طرح کروں ہوں ادا
یہ فصاحت یہ طرز گویائی   کس میں ہے کہ تو تو مجھے بخدا
میری تیغ زباں ہے دو شمشیر   جس کا مارا نہ حشر کو بھی اوٹھا
ہے میرا دست زور کلہ شکن   مجھ کو وہ کہئے تو ہے یہ منہ تیرا
مرغ خوش خواں کا ہو نہ ہم آہنگ   ہانک گو باغ میں پھرے بدّا
گو کہ دکھتا ہے بیل کی صورت   ہمسر بیل کیوں کے ہو پٹھا
میری اور تیری ہے جو سچ پوچھے   نسبت سیل تیرہ و دریا[1]

•

ہے شکایت مجھے یاروں سے کہیں دشمن جان   انکے ہاتھوں سے نہیں ملتی کسی طرح اماں
باندھتے ہیں کبھی مضمون چرا کر میرے   پہ پیچ الفاظ میں ہو جس سے بلاغت کا زیاں
کبھی کرتے ہیں یہ دعوی میری ہم چشمی کا   نہیں معلوم مجھے ان کی گئی عقل کہاں
مجھ کو بتلا دے تو کوئی کہ بھلا جرم تھا   کون سے روز ہوا رو کش مہر تاباں
کوئی در پے ہے کہ باتوں میں مجھے دے ٹوک   کوئی ڈھونڈھے ہے کہ عیب اسکے سخن میں ہیں کہاں
بعضے ان میں سے جو شاگردی کا دم بھرتے ہیں   وہ بھی در پے ہیں میرے خواہ عیاں خواہ نہاں

---

[1] قصیدہ منقبت حضرت علی صفحہ ۱۲۴، ق-ن-پ-ی-ل

شعر پڑھتے ہیں میرے نام سے اپنے ہر جا   چاہتے ہیں کہ ملے ہم کو بھی کچھ نام و نشاں
اور تو سادہ دلی دیکھیے میری میں اُن سے   اس پہ بھی آپ سے جاتا ہوں ملا روز و شباں
لکھنؤ والوں کو کیا دوس کہ دلی کے بھی   عمر عیار تھے ایسے ہی میرے شاگرداں
سن کے آبادی کا شہرا طرفِ مشرق کے   چھوڑ کر دلی کو یکبار جو آیا میں یہاں
میرے اشعار زبانوں پہ لگے جب پھرنے   چونک اُٹھے سُنکے وہ نہیں تھے چیلیاں کوہ گراں
یعنی کچھ سوچ کے آکر ہوئے ہمدم میرے   بعضے بیٹھے رہے پر ہاتھ میں لیے تیر و کماں
پر میں ڈرتا تھا کوئی تیر کماں سے اُنکے   کیونکہ تھا مجھ کو فن تیر بری میں جولاں
آخر کار خبر آنے کی سُنکر میرا   صحبتِ شعر کا بانی ہوا ایک طرفہ جواں
روز ایک زمزمہ شعر تعین کرکے   آیا مجھ پاس کہ کل آپ مقرر ہوں ہاں
میں کہا اُس سے کہ البتہ میں حاضر ہوں گا   پر بتا دو مجھے اس جا کا وہ صحبت ہے جہاں
الغرض میں جو وہاں جاکے ادب سے بیٹھا   دیکھ کر مجھ کو ہوئے بعضے ۔ ؟ خنداں
مجھ میں ہر چند بظاہر تو نہ تھا عیب کچھ اور   غیر اسکے کہ پریشانی تھی ایک مجھ سے عیاں
بزم نامحرم و مردم ہمہ بیگانہ تمام   دیدہ وحشت زدہ و دل بغل بود طپاں
ہوئی القصہ جو تاریکی شب جلوہ فروش   بزم کے بیچ رکھی لاکے وہ شمع سوزاں
شعر خوانی ہوئی آغاز بڑے لوگوں سے   نام کس کس کا میں لوں یعنی فلاں ابن فلاں
شعرا اور سے غزل پڑھتے تھے باہم وہ تمام   اور باہم ہی یہ تحسین سے تھے فریاد کناں
متوجہ ہوئے سب گوش زباں کرکے بلند   آئی جب دورے میں نوبت مجھے پڑھنے کی وہاں
بعضے بے خبری سے خاطر میں نہ لائے مجھ کو   جی ہی جی میں گئے بعضے سمجھ انداز بیاں
. . . تھا میرے ساتھ میرا یارِ قتیل   دوسرا رات کے رہنے میں شریک اسکے وہاں

الغرض یونہی جو ہونے لگی صحبت ہر ماہ — اور میرے جوش طبیعت نے کیا کسب جلال
... ہوئیں غزلیں قلم سے میرے اعجاز کی شکل — جن کو سن کوئے بہت تنگ سبھے پیر و جواں
بعضوں نے کام حسد کو جو ذرا فرمایا — اور یہ سمجھے کہ ہیں ہم شاعر با نام و نشاں
... میدان میں پانبکے تئیں باندھ کے د — پر نہ سمجھے کہ یہ ہے ہند کا رستم دستاں
مجھ کو پروا ہی نہ تھی کب اون کی کہیں خفا نہ کور — مورچہ کی کبھی پروا نہ کرے پیل دماں
اسی صورت سے جو گزریں کئی صحبتیں باہم — قوت طبع میری اون پہ ہوئی خوب عیاں
جب غزل پڑھنے لگے وہ تو بگوش سامع — رونے اور پیٹنے کے چھٹ نہ گیا انکا بیاں
... کے وہ بے محل اون کی تحسین — اور سخن کہنے میں یہ سوز کہ خود مرثیہ خواں
جب غزل میں نے پڑھی جیں مخالف سے وہ نہیں — شور تحسین کا گیا تا بہ سپہر گرداں
اس سے جو ہونے لگی اُن کی خواری — اور ہوئے تیغ زباں سے میری جی میں ترساں
مجھ کو پیغام دیا صلح کا عاجز ہو کر — نہیں لازم جو کروں اُس کا یہ تصریح بیاں
میں تو کچھ دل میں نہ رکھتا تھا انہوں سے کینہ — کینہ اپنا ہی وہ کرتے تھے غزل کہہ کے عیاں
سو ملاقات کے دن آئے جو سو عقدہ یہ پیش — اٹھ گیا بغض و جدائی .. صفائی میاں
مصحفی مجھ سے قصیدہ یہ ہوا جبکہ تمام — اس قصیدے کا رکھا نام میں تیغ بُرّاں[1]

میرا نہ جمہوروں کی طرف روئے سخن ہے — اس بات کو وہ سمجھیں جو ہیں سخن گر

---

[1] قصیدہ تیغ بُرّاں صفحہ ۴۳۴۔

کہتے ہیں کہ سودا نہیں اس عہد میں آئے ہے　　یہ حرف ہے کیا محض غلط رکھتا ہے تشہیر
سودا جو نہیں ہے تو نہ ہو میں تو ہوں بیٹھا　　سودا کی جگہ مسند معنی پہ یہ توقیر
جو چاہے کرے مجھ سے فن شعر میں پنجہ　　سودا نہیں بیٹھے تو نہیں سودا کی جگہ میر
سودا تھا قصیدے میں اگر دوسرا بہزاد　　ہر بیت قصیدے کی ذرا دیکھیے تصویر[1]

•

وہ ہی ہوں میں کہ جیسے فیضی زماں انشا　　سمجھ کے دل میں نہ لاتا تھا کچھ خیال غرور
وہ ہی ہوں میں کہ جیسے خانہ زاد خانصاحب　　کہ میں ہیں نثر میں اپنی کلیم طور شعور
وہ ہی ہوں میں جیسے رنگین نے اپنا . . .　　دکھائے باتمامی کیا ہے دفع خطور
وہ ہی ہوں میں کہ جیسے بیر سوز سلمہ　　کہے ہے یا بتلفظ ستائش موفور
وہ ہی ہوں میں کہ جیسے میر مقتحر کہہ کر　　کہے ہے ہاں جو کچھ آجائے ہے کبھی مذکور
وہ ہی ہوں میں کہ جیسے میرزا انبیل سحر بیاں　　کرے تھا طرح پہ اپنی ید دستی ماہور
وہ ہی ہوں میں کہ جیسے دیوانہ سر سنگھ نام　　لگے تھا سر کو جھکانے میاں راہ از دور
وہ ہی ہوں میں جیسے فاخر نے بعد دیدار　　کہا کہ پیجیے حقہ میاں نہ جھور
وہ ہی ہوں میں جیسے جرأت بھی خوب جانے ہے　　کہ فن ریختہ میں ہے ہی یہ بڑا پر زور
وہ ہی ہوں میں کہ رہا جس کی نظم دلکش پر　　مشاعروں میں ہمیشہ سے شور روز نشور
عجیب معاش ہے ان دوستان یکدل کی　　اس اتحاد پہ کچھ بھرے ہیں دل میں فتور[2]

•

ہے اس زمانہ میں ایسا کوئی تو مغوی خام　　کہ کہہ کے ذم کے سخن ختم کرے ہے بے نام

---

[1] قصیدہ در مدح سلیمان شکوہ صفحہ ۴۲۰　[2] قصیدہ ناتمام در مدح سلیمان شکوہ صفحہ ۴۴

سو نسبت اُنکی جو ہیں سلسلہ میں سودا کے — غریب خانہ نشین و مہذب الاقدام
بس اپنے واسطے . . . . آشفتہ — ہمہ جو ہیں آئے میرے ذہن میں کچھ کریں اتمام
غرض یہ طرفہ تماشا ہے اب ہوا ردو لوش — بخار دل سے نکلتے ہیں یوں ہو زبا فرجام
جو لوگ آج ہیں قائم مقام مرزا کے — کروں گا ہجو میں تا حق انہوں کی نام بنام
کہ دوست اپنے جو ہوں تو وہ بھی پھر نہیں دشمن — یہی تو چاہیے ہے البتہ آسماں کی خرام
میرے شفیق ہیں . . . . — کمال ساتھ متانت کے ہے انہوں کا کلام
پھر اُنکے بعد محمد رضا سے اردو داں — ہے میرے سامنے مربوط ان کا پختہ و خام
سلیم و سید پاکیزہ میر فخر الدین — کہ نکلے ہمیشہ وہ مرزا کے کاتب الہام
رفیع ہے یہ کلام اُن کا فیض مرزا سے — کہ آفتاب کے پہلو میں جوں رہے ماہ تمام
تخلص اُن کا ہے ماہر ہیں حسب اصلاح — ہنسوڑ گو اُنہیں کشمیر کا کہیں حجام
میں ان کو جانتا ہوں اپنا کعبہ و قبلہ — رکھونگا انکی میں ریش سپید پہ کچھ تام
لکھے ہے جا کہ معنی کو اور صورت سے — کبھی سنوں ہوں کہ مصور کا شاعری ہے نام
کبھی سنوں ہوں کہ منڈی کٹنے میرے لیے — کیا ہے از سر پا ایک نیا قصیدہ تمام
سبب کچھ ان کے بگڑنے کا پر نہیں کھلتا — اگر یہی ہے کہ فخریہ کیوں ہے اس کا کلام
ذرا کہ قصائد عرفی کی جائے سیر کریں — کہ اُس میں فخریہ از ابتدا ہے تا انجام
مقام لات ہیں آ آکے اُس سے ہے یہ سخن — رکھا ہے بوالفرح و انوری پہ کیا کیا نام
چلا جو چال قصیدے کی میں بھی کیا ہے گناہ — اسی طرح سے تشبیب کے ہیں کئی اقسام
غضب تو یہ ہے کہ سودا بھی اپنا فخریہ — ہر قصیدہ میں دعوے سے کر گیا ادغام
سمجھنے یہ نہیں ایراد اُس پہ ہے اول — گر اس کلام پہ بندا ہے سودا الزام

میں گوشہ گیر ہوں مدت سے پر یہ قہر سنو　　کہ جب گیا ہے کبھی گر تم اُس طرف ناکام
لکھیں ہیں ہجو میاں مصحفی بہم یہ لوگ　　دیا ہے بس یہی شاہ کمال نے پیغام
پر اب تلک تو نہ بھیجا کسی نے اک پرزا　　بہت ہی بعید ہے لکھائیں اگر قصیدہ تمام
یہ وہ مثل ہے کہ جس طرح دُور سے روبا　　فغاں کرے پہ نہ آوے مقابل ضرغام
سو کب میں شورش بیجا سے انکی ڈرتا ہوں　　انہوں کی ہجو کو اک گرم بس ہے اور یہ تمام
میں اپنی شان میں عنقا ہوں قاف معنی کا　　یہ پہنچے مجھ تئیں کب ہے میرا بلند مقام
لگھو مڑوں کے بھی آتا ہے دام میں سیمرغ　　یہ میرے واسطے ناحق بچھا رہے ہیں دام
نہیں یہ ہجو کے قابل پہ ان کی خدمت کو　　جو یوں ہی چاہیں تو کافی ہیں بس میرے خدام

اگرچہ سب ہیں نواخواں ولیکن اُس کے یہاں سے
بلا ہیں منتظر و گرم چوں برہنہ حسام[1]

ہوں شیخ مصحفی کا میں حیران شاعری　　اللہ رے مفلسی ہیں یہ کچھ شان شاعری
روندا اسے تمام مرے رخش کلک نے　　سودا سے بچ رہا تھا جو میدان شاعری
پیس اور یہ کے سودہ نمک اس میں بھر دیا　　تھا اوس کا کم نمک جو نمکدان شاعری
ہندوستان کی گردن خرد و بزرگ پر　　ہے ہیچ تو یہ میرا ہی ہے احسان شاعری
پیرو ہیں میرے طرز کے یہاں چھوٹے اور بڑے　　ملک سخن کا ہوں میں سلیمان شاعری
رہتے ہیں اپنا ثانی میں اب اوس کے ادبیار　　تھا ہاتھ میں میرے جو گریبان شاعری
رکھتی ہے نوک خامۂ جادو رقم ہنوز　　مژگاں نم سے تازہ گلستان شاعری
سو موندی جو آنکھ میں نے تو چشم زمانہ سے　　چھپ جاویگا وہ نہیں مہ تابان شاعری
ہیں ابتدائے عمر میں مدت ۔۔۔۔ تلک　　چھانا ہے فارسی کا صفاہان شاعری

---

[1] قصیدہ بر عنوان تعصب و نسبت چند شخص گفتہ شد صفحہ ۴۵۴ و ۴۵۵

بعد اوس کے ریختہ کی بھی رکھی ہے وہ بنا — حیران ہیں جسکے نقش طرازان شاعری
کچھ کچھ کہے ہیں بحر عربی میں بھی شعر تر — اوس میں بھی بن گیا ہوں میں سحبان شاعری
دن رات میرے ناخن نوک قلم میں ہیں — لاکھوں طریق و شیوہ و عنوان شاعری
ہر سفلہ کا ذہن یہ نہیں ہے کہ ہو سکے — میرے سوائے شمع شبستان شاعری
جس روز میرے جسم سے نکلے گی میری جان — یہ جانیو تو آج گئی جان شاعری
لاکھوں ترانہ سنج ہوئے جس سے ریزہ چیں — اے مصحفیؔ میرا ہی ہے وہ خوان شاعری[1]

مصحفیؔ ریختہ پہنچا ہے مرے رتبہ کو
شہرہ یہاں گرد ہے مرزا کی میرزائی کا

ہے جام طرب ساغر پر خوں میرے آگے — ساقی تو پلا بادۂ گلگوں میرے آگے
ٹک لب کے ہلا دینے میں حسام عجم کا — ہو جاوے گا احوال دگرگوں میرے آگے
بھولی ہوں ایسے مہرۂ بازیچۂ طفلاں — کس کام کا ہے گنبد گردوں میرے آگے
جب بیٹھ کے یہ آتا ہے میرا توسن خامہ — بن جاویں ہیں تب کوہ بھی ہاموں میرے آگے
میں گوز سمجھتا ہوں سدا اس کی صدا کو — گو بول اٹھے ادھی کے پیچوں چوں میرے آگے
قدرت ہے خدا کی کہ ہوئے آج وہ شاعر — طفلی میں جو کل کرتے تھے غاں غوں میرے آگے
سب خوشہ ربا ہیں میرے خرمن کے جہاں میں — کیا شعر پڑھے گا کوئی موزوں میرے آگے
موسیٰ کا عصا مصحفیؔ ہے خامہ میرا بھی — گو خصم ہے اسود افیوں میرے آگے

* * *

سوداؔ کا تو مردہ ہو چکا ہے بازار — اب بزم سخن ہے مرے دم سے گلزار

---

[1] غزل قلمی نسخہ کلیات صفحہ ۱۵۵-۱۵۶ ۔

ہے نشان تری جلوہ گری میں ہر وقت   سچ ہے کہ تجلی کو نہیں ہے تکرار

•

شاعرانہ تعلی کی یہ مثالیں جو قصیدوں، غزلوں، قطعوں اور رباعیوں میں ہر جگہ ہیں۔ اس کثرت اور شدت سے ہیں کہ انہیں محض رسمی کہہ کر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مصحفیؔ ایک شدید ذہنی اور نفسیاتی الجھاؤ میں مبتلا تھے۔ تعلی تو محض جذبۂ خود پرستی کی تسکین کے لئے ایک ذریعۂ اظہار ہے لیکن یہاں محض خود پرستی کا دبا ہوا جذبہ ہی ابھرنے کے لئے بے چین نظر نہیں آتا بلکہ معاصرین سے چشمک، ان سے مقابلہ، کبھی ان کی شہرت اور قبول عام کا اعتراف، کبھی ان کی ہمرنگی کا دعوے، کبھی ان کے میدان کو مکمل کرنے کا اعلان کہیں ان کے مقابلہ میں اپنی برتری کے لئے دلیلیں اور شواہد اور اس سلسلہ میں ان کی تضحیک اور ہجو، غرض طرح طرح کی کیفیتیں نظر آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ حریفوں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک طرف خاص طور سے میرؔ اور مرزاؔ ہیں، دوسری طرف مصحفیؔ اور ان کے شاگردوں میں گرمؔ اور منتظرؔ ہیں، یا یہ دونوں شاگرد ہی ہیں جو انشاؔ سے معرکے میں بھی پیش پیش تھے۔ میرؔ یا ان کے شاگردوں سے براہ راست کبھی بدمزگی کا موقع نہ آیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوداؔ کا رنگ عام طور پر لکھنؤ اور دلی میں دونوں جگہ یکساں طور پر مقبول تھا۔ اور مصحفیؔ خود بھی اسی کو اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ نہ ان کی طبیعت میں وہ شگفتگی تھی جو سوداؔ کو فطرت نے بخشی تھی۔ اور نہ ایسا کوئی مربی اور سرپرست انہیں نصیب ہوا کہ اس کی داد و دہش یا کم از کم سرپرستی انہیں ایک طرف فکر

معاش سے فارغ کر دیتی اور دوسری طرف ان کے حریفوں کا منہ بند ہو جاتا۔ مصحفیؔ سمجھتے تھے۔ کہ اس معاملہ میں اُن کے ساتھ بڑی نا انصافی اور ظلم ہوا ہے وہ معاصرین میں اپنے علم و فضل اور فنی لیاقت کے اعتبار سے کسی کو اپنا مقابل تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ایک انشاؔ کو چھوڑ کر اس وقت کوئی دوسرا شاعر اس علم اور فضل کا مالک نہ تھا۔ مصحفیؔ نے اپنے تذکروں مجمع الفوائد اور دوسری تحریروں میں اپنے تحصیل علم کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ پھر اُنہیں اُردو یا ریختہ سے قطع نظر اپنی فارسی نظم و نثر پر بھی بڑا ناز تھا۔ اور کم از کم اس اعتبار سے وہ خود کو میرؔ سوداؔ، میر دردؔ اور دوسرے معاصرین سے ممتاز سمجھتے تھے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ قدردانی سے محروم رہے۔ اور اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے انہوں نے تعلی کا یہ انداز اختیار کیا، وہ چاہتے تو ہجو گوئی پر بھی اُتر آتے۔ لیکن اس کا انہوں نے بار بار اعتراف کیا ہے۔ کہ یہ اُن کے بس کی بات نہیں، شاید ایسا کر لیتے تو اُن کی طبیعت کی تلخی اور الم ناکی کسی حد تک کم ہو جاتی۔

اس پر ستم یہ ہوا کہ اُن کی مالی حالت ہمیشہ خراب رہی، دلّی کی ویرانی کے بعد پورب آنے کی تحریک صرف اُس فیاضی اور دریا دلی کی شہرت سے ہوتی تھی جو فیض آباد اور لکھنؤ کے آنے جانے والے سنایا کرتے تھے۔ آخر یہی چیز سراج الدین علی خاں آرزوؔ، مرزا سوداؔ، میر تقی میرؔ، میر سوزؔ، انشاؔ، جرأتؔ، رنگینؔ، ضاحکؔ، میر حسنؔ، جعفر علی حسرتؔ اور خود مصحفیؔ کو لکھنؤ لائی تھی۔ لیکن یہاں اور کیا گذری۔ اس کا نقشہ خود ان کے کلام میں دیکھئے:۔

در ہجو چارپائی خود کہ کہنہ شدہ بود

یہ جو ہم پاس چارپائی ہے   گو دہے یا کتیاں یا کھائی ہے
پٹی پائے تمام ناہموار   اور بانوں کی جھول جیسے کہ غار
کج دوا کج ہے بسکہ وہ یکسر   نحش گردوں کو رشک ہے جس پر
کیوں نہ دل داغ غم سے ہو پلنگ   کہ درندے ہوئے ہیں مثل پلنگ
ڈھانچ ہے اُس کا بسکہ اول جلول   کہیں سل بیٹھتی نہیں ہے چُول
پائے ہیں کہنگی سے زرد و سیاہ   سیرووں کا ہے حال پھر بھی تباہ
بسکہ ہے ڈھلڈھلی و پوچ و لچر   چُول کو روز چاہیئے پچر
اور کستا ہوں جس دم ادوائن   اک ذرا اُس گھڑی تو جائے ہے تن
لیک جسوقت اس پہ پاؤں دھرا   جیسے کوئی کنوئیں میں آن گرا
بامت کی اُس کی کیا کروں تعریف   تھا وہ بافندہ بسکہ ذات شریف
چھید رکھے ہزار دہ بانوں میں   گرہیں بے شمار بانوں میں
گر گدیلے کا اُس پہ ہو بستر   تو بھی چُبھتی ہے پھانس جوں نشتر
آکے جب لے انت اُس پہ سوتا ہوں   کرکے ضامن کو یاد روتا ہوں
یہ وہی ناتواں پلنگڑی ہے   جس کو کہتے ہیں لولی لنگڑی ہے
نہ چھپرکھٹ سے اُس کی نسل میں ہے   نہ کھٹولے کی قسم کوئی کہے
بسکہ ہے تنگ گھیرا اُس کا نانو   اُس پہ بیٹھے پڑے ہے کاٹھ میں پانو
نیچے اونچے جو اُسکے ہیں پائے   ہیں معطل زمیں پہ پڑوائے

بسکہ دل اُس سے خوش نہیں ہوتا   مارے غصہ کے میں نہیں سوتا
جب کہیں آدھی رات جاتی ہے   اونگھ کے مارے نیند آتی ہے
کیونکہ اُس پر کوئی دوگانہ ہو   گر رہے مجھ سا جو یگانہ ہو
طول میں میرے قد سے ہے کمتر   عرض میں میرے تن سے ہے لاغر
ایسی جب تنگ چارپائی ہو   بس مسافر کی کیا سمائی ہو
اب بھی جانے تو گھر کو خالی کر
مصحفی اس سے بوریا بہتر[1]

یہ تو مصحفی کی چارپائی تھی، اس میں کھٹملوں کی افراط کا حال سنئے:۔

در ہجو افراط کھٹمل

کھٹملوں کی زبسکہ ہے افراط   تلخ ہے ان سے اپنا خواب نشاط
کافروں نے یہ سر اٹھایا ہے   سارے پینڈے کو توڑ کھایا ہے
بسکہ بیچین ہوں میں انکے ہات   نیند آتی نہیں ہے ساری رات
دم بدم کروٹیں بدلتا ہوں   اِدھر اُدھر پڑا اُچھلتا ہوں
پائینچہ میں کبھی گھس آتے ہیں   کبھی نیفے میں سرسراتے ہیں
اک خلش ساری رات ازار میں ہے   آنکھیں بند اور ہاتھ ازار میں ہے
مارتا جاتا ہوں انہیں جوں جوں   کان پر انکے رینگتی نہیں جوں
لوہو پی پی زبس ہوئے موٹے   ریزہ لعل ہیں بڑے چھوٹے
تلے کروٹ کے آ جو جاتے ہیں   دو نہیں جھنجھلا کے کاٹ کھاتے ہیں

یا

---

[1] کلیات صفحہ ۲۳۹

الغرض شام سے ہو نشیب بیدار   کھیلتا ہوں میں کھٹملوں کا شکار
مارے جو موئے چُن چُن کر   چھینٹ کا تھان بن گئی چادر
گھسے دیوار پر جو کر کے تلاش   کر دیا گھر کو خانہ نقاش
کوئی کیونکر کرے اُنھوں کا شمار   پیدا ہوتے ہیں ایک سے یہ ہزار
ہے بجا بسکہ ہیں زمیں پہ زیاد   کہیے راون کی ان کو گر اولاد
دوڑتے ہیں زبسکہ ہیں چالاک   میری آنکھوں میں ڈال جاتے ہیں خاک
کوئی آسان ہاتھ آتے ہیں   گھائیوں میں سے نکلے جاتے ہیں
ان کی بو سے دماغ عاجز ہے   بلکہ دود چراغ عاجز ہے

دشمن جاں یہ مصحفی کے ہیں
تشنہ خوں یہ ہر کسی کے ہیں[1]

اس پر اگر مصحفی کے مکان کی حالت پر غور کریں تو نقشہ مکمل ہو جاتا ہے :-

اپنے رہنے کا جو ملا ہے مکاں   ہے بعینہ وہ صورت زنداں
اُس میں مطلق نہیں ہوا کا گزر   سیر یلدا کی وہاں کرے ہے نظر
نہ تو روزن نہ اُس میں جالی ہے   دن وہ ہے (؟) جیسے رات کالی ہے
جائے بول اُسکے در کے آگے ہے   جو ہر مغز کو جلائے ہے
خاکبازی ہے اُسکی چھت کا کام   خاک اُس سے جھڑا کرے ہے مدام
چارپائی جو میں اُٹھاتا ہوں   اِدھر اُدھر اُسے کھچاتا ہوں

---

[1] کلیات صفحہ ۴۶

دل کو کاوش ہی رات اور دن ہے — بسکہ پسوؤں سے اُس میں بھن بھن ہے
کبھی چیلٹی بدن کو کاٹے ہے — کبھی دیمک ہی پائے چاٹے ہے
گر نظر جائے جانب دیوار — نظر آتی ہے چیونٹیوں کی قطار
رات دن جی صفا کو ترسے ہے — اپنی قسمت کی خاک برسے ہے
گھر میں میرے جو کوئی آتا ہے — اپنی صورت کو بھول جاتا ہے

مصحفیؔ جائے سینہ چاکی ہے
گھر نہیں یہ تو برزخ خاکی ہے[1]

ظاہر ہے یہ نقشہ ایک ایسے شخص کی زندگی کا ہے جسے دُنیا کی مُسکراہٹوں میں سے کوئی حصہ نہ ملا ہو۔ مصحفیؔ کی خانگی زندگی بھی زیادہ خوشگوار نہ تھی۔ کئی بیویاں کیں لیکن ازدواجی زندگی کا سکون اور سچی راحت نصیب نہ ہوئی۔ اولاد کی طرف سے بھی محروم رہے۔ اور اس پر تاسف کرتے رہے۔ ایک بھائی جوان مر گیا۔ دوسرے نے درویشی اختیار کر لی۔ غالباً مصحفیؔ کی نفسیاتی اُلجھنوں میں ان سب باتوں نے اضافہ ہی کیا ہوگا۔ اُن کے سامنے فکرِ معاش کا مسئلہ بھی تھا۔ شاعروں کے لئے صرف ایک ہی ذریعہ تھا یعنی کسی امیر کا توسل، مصحفیؔ کے ممدوحین کے نام سُنیئے:۔

۱۔ دلّی میں نواب قمر رکاب امین الدولہ معین الملک عرف مرزا مینڈھو خلف نواب شجاع الدولہ۔
۲۔ میر محمد نعیم خاں

---

[1] کلیات صفحہ ۷۵۔

۳۔ فخرالدین احمد خاں عرف مرزا جعفر۔
۴۔ نواب کلب علی خاں بہادر۔
۵۔ قمرالدین احمد خاں عرف مرزا حاجی۔
۶۔ مرزا سلیمان شکوہ۔
۷۔ نواب مہدی علی خاں۔
۸۔ صفدر علی خاں۔ (۹) مرزا تقی ہوس۔
۱۰۔ نواب غازی الدین حیدر۔
۱۱۔ نواب روشن الدولہ۔
۱۲۔ نواب ہادی علی خاں۔
۱۳۔ میر فضل علی داروغہ بادشاہ بیگم۔
۱۴۔ جہاں دار شاہ۔ (۱۵) نواب یوسف علی خاں۔
۱۶۔ نواب محبّت خاں (۱۷) مرزا علی حسن خلف نواب سالار جنگ
۱۸۔ لالہ ٹیکا رام۔ (۱۹) خیالی رام۔ (۲۰) آصف الدولہ۔
۲۱۔ شاداب علی خاں:۔

یہ سب وہ لوگ ہیں جن کی تعریف میں مصحفی کے قصیدے موجود ہیں یہ طویل فہرست خود ظاہر کرتی ہے۔ کہ مصحفی کو یہ چین نصیب نہ ہوا۔ کہ یک در گیر محکم گیر کے اصول پر کاربند ہو کر عیش و عشرت یا فارغ البالی نہ سہی۔ دو وقت کی روٹی اور ستر پوشی کے لئے کپڑے کا سہارا ہو جاتا۔ مصحفی کا جو حشر ہوا وہ انہیں کی زبان سے سنیئے:۔۔۔

ملتی نہیں ہاتھوں سے سفیہوں کے اماں   ہوتا ہی رہتا ہے مفت پیسے کا زیاں
تنخواہ تو یادے اب ملتی ہے مصحفی لیکن   بستا تحریر سودی آفتِ جاں

•

شاہا کہ وسیع ہے تیرا دستِ سخا   گزرے کئی ماہ از رہِ لطف و عطا
انعام ہوا تھا جو دوشالہ مجھ کو   رنگت کیلئے ہے وہ کھٹائی میں پڑا

•

ہرچند کہ ہم فاقوں سے جاں دیتے ہیں   تنخواہ تو کب نعیم خاں دیتے ہیں
ہے لب پہ خوشامد اور غضب کے مارے   بیٹھے ہوئے جی میں گالیاں دیتے ہیں

ظاہر میں تو ہاں نعیم کے نوکر ہیں   باطن میں وہ کریم کے نوکر ہیں
نہ عید نہ بکرید نہ روزے نہ دہارد؟،   ہم بھی عجیب اک نعیم کے نوکر ہیں

دی بانٹ محل میں چُن چُن کے تنخواہ   اور ہم کو بہانوں میں ہی ٹالا کئے ماہ
انصاف سے کتنا دُور ہے میر نعیم   لاحول ولا قوۃ الا باللہ

دیئے آغا نے روپے چالیس گر   نوبت تنخواہ کر گیا یہ خیر
بھاگتے چور کی لنگوٹی ہے   مصحفی ہاتھ گر لگے کر صبر

اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا۔ کہ مصحفی کی طبیعت میں تلخی اور زہرناکی اور بڑھ گئی اور انہوں نے جب اپنے ماحول کا جائزہ لیا۔ تو وہاں بھی انہیں تسکین کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ اُن کے سیاسی ماحول کا کچھ ذکر ہو چکا ہے دلّی کی عام حالت یہ تھی کہ شاہ عالم بس برائے نام بادشاہ تھے۔ مختلف

سیاسی پارٹیاں، درباری امرا اور رؤسائے دلی کی سیاسی اسٹیج پر کٹھ پتلیوں کی طرح بادشاہوں کو اُتارتے بٹھاتے رہتے تھے۔ خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ فوجی اور سپاہی تنخواہوں کے نہ ملنے سے پریشان تھے۔ عوام کی فارغ البالی بھی رخصت ہو چکی تھی۔ لوٹ۔ چوری۔ قتل اور غارت گری کا بازار گرم تھا۔ اگر کوئی شے سستی تھی تو صرف موت، اس تصویر کو سودا نے اپنے قصائد اور ہجویات میں خوب دکھایا ہے خاص طور پر قصیدۂ شہر آشوب، قصیدۂ تضحیک روزگار، اور ہجو شیدی کوتوال کے پڑھنے سے اس کا بالکل صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ میر نے ذکر میر اور اپنی بعض مثنویوں میں بھی یہی نقشہ کھینچا ہے۔ مصحفی کا انداز یہ ہے ؎

نایاب ہے طالب ہی زمانہ میں وگرنہ   سینہ میں میرے معدنِ الماس نہاں ہے
اور ہے تو شہنشاہ جہاں خسرو عالم   آباد یہ کچھ جس کی عدالت سے جہاں ہے
کہتی ہے اُسے خلقِ جہاں سب شہِ عالم   شاہی جو کچھ اُسکی ہے سو عالم پہ عیاں ہے
اطراف میں دلّی کے یہ ٹھگ ماروں کا ہے شور   جو آئے ہے باہر سے وہ لب‌بستہ دہاں ہے
اور پڑتے ہیں راتوں کو جو نت شہر میں ڈاکے   باشندہ جو وہاں کا ہے بفریاد و فغاں ہے
اس شہر کا جس دن سے ہوا اسندھیا حاکم   چوروں کی وہاں سیندھ سے ہر ایک نگراں ہے
بیداد سے نائب کی برا حال ہے واں کا   ہر روز نیا قافلہ پورب کو رواں ہے

اُتریں ہیں وہاں پگڑیاں بس شام کے ہوتے   چالاکیِ دست ایسی یہ اندھیر کہاں ہے
ہر وقت تلنگے جو کھڑے رہتے ہیں اُن سے   بس قلعہ کے نیچے ہی تک ایک امن و اماں ہے
جز دیدۂ گریاں نہیں منبع کسی گھر میں   ناسور ہے سینہ کا اگر آب رواں ہے
آوے ہے نظر جو دلِ عشاق شکستہ   اس شہر میں جو قصرِ فلاں ابن فلاں ہے

بیٹھے تھے جہاں کجکلاہ تکیہ لگا کر   واں اب جو نظر کیجیے تو تکیہ کا مکاں ہے
روتا ہوا گذرے ہے جو کوئی ابر کا ٹکڑا   احوال غریباں ہی پہ وہ اشک فشاں ہے
رہتا ہے سدا ان ہی پر برگ حوادث   افسوس کہ کب خواب فراغت میں غلطاں ہے
اس شہر کے باشندوں سے جا کر کوئی پوچھے   جز خون جگر کچھ بھی غذائے دل و جاں ہے
... بتدریج انہیں رزق کم و بیش   اور چاہیں فراغت سو فراغت تو کہاں ہے
خورشید دکھاتا ہے سحر دور سے گردہ   اور شب کو مہ نو کی ہی دو لب ناں ہے

...... پھیلی ہے خرابی   ناقوس کا نالہ نہ موذن کی اذاں ہے
بازار نشیں تھا جو کوئی صاحب حرفہ   اس شہر میں سو اسکو کہوں کیا وہ کہاں ہے
... کی صورت نظر آتی نہیں مطلق   اور ہے بھی تو جوں سوزن گم گشتہ نہاں ہے
کس واسطے اک آن میں حاکم کا پیادا   آتا ہے ابھی پوچھتا زر بیں دو زر کہاں ہے
... دوشالوں کے تئیں اپنے رفوگر   بقچہ کے تئیں مار بغل گھر کو رواں ہے
جوں تیر فرار اُس نے بھی بدقت سے کیا ہے   دوکان مقفل ہے کماں گر نہ کماں ہے
... دیکھے ہے جسے راہ میں جاتے   طرار بھی تب پیچھے ہی سے جوں سایہ رواں ہے
صراف لیے جاتے ہیں کاندھے پہ جو تھیلی   اتنے میں اُسے پھر کے جو دیکھئے تو کہاں ہے
... نہ خان کوئی رہا شہر میں باقی   نواب جو گوجر ہے تو میواتی بھی خاں ہے

گوکا و کشتی شہر میں موقوف ہوئی ہے   اب اُن کی جگہ خون رعیت کا رواں ہے
احوال سلاطین لکھوں کیا ....   یعنی کہ مہ عید اب اُن کو لب ناں ہے
فاقوں کی زلیں مار رہے بیچاروں کے اوپر   جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہ رمضاں ہے
ایک سوچ میں بیٹھا ہے کہ آئے ابھی خاصہ   ایک ...... نگراں ہے

ایک بغلیں بجا خواں کو یوں کچھ کہے ہے   کچھ نام خدا آج تو یہ خواں گراں ہے
اتنے میں اُتارے ہے جو سر پر سے کہار   . . . . . خاصہ کہاں ہے
گل جائے زباں میری کروں ہجو گراں کی   یہ ننگ معاشی کا سلاطین کے بیاں ہے
اے مصحفیؔ اس کا کروں مذکور کہاں تک   ہے صاف تو یہ گلشن دہلی میں خزاں ہے[1]

اس قصیدے کے علاوہ غزلوں میں بھی بار بار دلّی کی اس تباہی اور ویرانی کا ذکر کرتے ہیں :-

دلّی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں   ویران ہیں محلّے سنسان گھر پڑے ہیں
دیکھا تو اس چمن میں باد خزاں کے ہاتھوں   اُکھڑے ہوئے زمیں سے کیا کیا شجر پڑے ہیں
بلبل کا باغباں سے اب کیا نشاں پوچھوں   بیرون در چمن کے ایک مشت پر پڑے ہیں

بقول مصحفی ان حالات میں روز ایک نیا قافلہ دلّی سے پورب کے سمت رواں ہوتا تھا۔ دلوں میں بڑے ولولے اور تمنّائیں ہوتیں، قدر دانی کی توقع صلہ کی اُمید، سکون کا سہارا۔ لیکن ان قافلہ والوں میں سے منزل پر پہنچکر مطمئن کوئی نہیں ہوا۔ دلّی کی گلیاں، وہاں کے میلے ٹھیلے، عرس اور چھڑیاں وہاں کی شعر و ادب کی محفلیں، اپنی رفتار، دستار اور گفتار سب یاد آتے اور آنے سے دل پر چرکے لگتے۔ دریائے لطافت میں انشاء اللہ خاں جو میر غفر غینی کی زبان سے سب کچھ ادا کرتے ہیں وہ اُن کے اپنے دل کی پکار ہے۔ اگرچہ اور لوگوں کی بہ نسبت انشاؔ کی قدر دانی خاصی ہوئی تھی۔ مصحفیؔ اس کا رونا یوں روتے ہیں :-

مصحفیؔ کب لکھنؤ میں میری قدر   اس خرابہ میں ہوا میں بن کا گُل

---

[1] کلیات صفحہ ۴۳

صحرا بیاں پورب کیا جانتے ہیں اس کو　اے مصحفی جدا ہے انداز اس زباں کا
یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے　ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت　اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

غرض اس سیاسی، معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر میں اب مصحفی کے کلام کا مطالعہ کیجیے۔ تو سب سے پہلے جو بحث سامنے آتی ہے۔ وہ دہلوی اور لکھنوی رنگ سخن کی ہے۔ اس وقت اُردو شاعری کی پوری تاریخ کا دہرانا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ لیکن اُس ابتدائی دور کو چھوڑ کر جس میں "نصف ہندی اور نصف فارسی" زبان میں امیر خسرو کی چند غزلیں یا بعض دوسرے صوفی شعراء کے چند اشعار یا مصرعے تاریخی یادگار کی حیثیت سے اہم ہیں شاعری کا باضابطہ اور باقاعدہ دور دکن سے شروع ہوتا ہے۔ یہ بات کوئی تعجب کی نہیں کہ اُردو زبان جس کی ابتداء سندھ اور پنجاب میں ہوئی اور جس نے شمالی ہند کی رائج الوقت پراکرتوں کی مضبوط بنیادوں پر اپنے قدم جمائے اس کی ادبی حیثیت کا آغاز سب سے پہلے اپنے اصلی مرکز سے ہزاروں میل دور گولکنڈہ اور بیجاپور کی سرزمین سے ہوا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا۔ کہ شمالی ہند کے درباروں میں فارسی کا طوطی بول رہا تھا، فارسی نثر اور نظم کا بازار گرم تھا۔ اور سرکاری عدالتی زبان ہونے کی وجہ سے عوام بھی اسی کی تحصیل کی طرف متوجہ تھے۔ اُردو زیادہ سے زیادہ عوام کے روزمرہ کاروبار یا صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں پروان چڑھ رہی تھی۔ اگرچہ اسے ملک کے عوام کی عام زباں بننے کے لئے یہی سب سے

مضبوط بنیادیں نہیں جو حاصل ہو سکتی تھیں۔ لیکن فارسی کے اثر اور اقتدار نے اس کی ترقی کی رفتار کو بے حد سست کر دیا۔ دکن میں سلطنتِ بہمنیہ کے دور سے ہی فارسی کے مقابلہ میں ملکی زبانوں کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا تھا کچھ تو سیاسی مصلحتوں نے اسے تقویت پہنچائی اور کچھ دکن سے ایران کا فاصلہ بھی اُن فارسی شعراء اور ادیبوں کی راہ میں حائل رہا۔ جو دلی اور اس کے قرب و جوار میں ہی پناہ پا کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ سلطنتِ بہمنیہ کے زوال کے بعد جب علیحدہ علیحدہ خود مختار ریاستیں قائم ہوئیں تو گولکنڈہ اور بیجاپور میں خاص طور پر اس نئی ملکی زبان کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ کیونکہ دونوں ریاستوں کے حکمرانوں نے خود اس زبان سے اپنی ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس میں شعر کہے۔ دیوان تصنیف کئے اور شعراء کی سرپرستی کی۔ چنانچہ جہاں تک تحقیق ہوا ہے، سلطان محمد قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ اُردو کا پہلا صاحبِ کلیات شاعر ہے۔ اس زمانہ میں گولکنڈہ اور بیجاپور شعر و ادب اور علم و فن کے مرکز تھے۔ چنانچہ مشہور شعراء میں وجدیؔ، وجہیؔ، سلطان محمد قطب شاہ، سلطان عبداللہ قطب شاہ، ابوالحسن تانا شاہ۔ نصرتیؔ، غواصیؔ۔ طبعیؔ۔ فائزؔ۔ قطبیؔ۔ نوریؔ۔ شاہیؔ۔ کمال خاں رستمیؔ۔ ابنؔ۔ سیواؔ۔ مومنؔ، مرزاؔ اور عاجزؔ کا کلام اب تک موجود ہے۔ اور یہ سلسلہ مغلیہ عہد میں ولیؔ تک پہنچتا ہے جن کے دیوان کی شہرت نے شمالی ہند میں فارسی کے مقابلہ میں ریختہ گوئی کی تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی یہاں تک کہ بعض لوگ اسی بناء پر انہیں اُردو شاعری کا باوا آدم اور موجدِ فنِ ریختہ تک بتاتے ہیں۔

اس دور کی شاعری کے سرمایہ پر نظر ڈالیں تو مثنویوں کی تعداد سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔ عاشقانہ، عارفانہ، ناصحانہ، واقعاتی، ذاتی، رزمیہ بزمیہ، مدحیہ، ہجویہ غرض ہر رنگ اور ہر نمونے کی مثنوی موجود ہے۔ خود سلطان علی قطب شاہ کی کلیات میں اس کی اپنی داستانِ حسن و عشق بھی ہے۔ اپنی بیگمات اور محلات کے تذکرے بھی پھولوں، پھلوں، میووں، تیوہاروں پر بھی مثنویاں ہیں اور ایک کالی بیگم کی ہجو بھی غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دکھنی شعراء نے فارسی مثنویوں کا ترجمہ بھی کیا اور طبعزاد مثنویاں بھی لکھیں۔ ان میں رسمیات کی پابندی بھی ہے۔ اور ذاتی تجربات، یہ تجربات مثنوی کی ساخت یا ڈھانچے میں نظر نہیں آتے۔ لیکن موضوعات کے انتخاب، تشبیہات اور استعارات کے استعمال، اور ہندوستانی فضا کو بطور پس منظر استعمال کرنے کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ رزمیہ مثنویوں میں فردوسی کے شاہنامہ کی سی ہماہمی نہ سہی لیکن نصرتی کے علی نامہ اور کمال خاں رستمی کے خاور نامہ میں اعلیٰ درجہ کی رزمیہ شاعری کے نمونے موجود ہیں۔ میدانِ جنگ کا نقشہ، بہادروں کی معرکہ آرائی، رن کی کیفیت، تلواروں، نیزوں، تبروں، بھالوں برچھوں اور ڈھالوں کی چمک دمک۔ نقاروں کی دھمک اور نعرہ ہائے جنگ کی گونج یہ سب عناصر موجود ہیں، عاشقانہ مثنویوں میں تخیل اور محاکات دونوں کے کمالات موجود ہیں۔ بلکہ قلی قطب شاہ کی ایک مثنوی میں محل کی چہل پہل اور کنیزانِ حرم کی شوخیوں کا وہی نقشہ موجود ہے جو بعد میں سحرالبیان میں میر حسن کے کمالِ فن کو ظاہر کرتا ہے۔

مثنوی کے بعد غزل گوئی اور مرثیہ گوئی آتی ہے۔ غزل گوئی یقیناً فارسی کی تقلید میں شروع ہوئی۔ اور قدرتی طور پر غزل کا دائرہ مفہوم اردو میں متعین ہوا جو فارسی میں پہلے سے چلا آتا تھا اور وہی مضامین، وہ اسالیب اختیار کئے گئے جو فارسی شعرا کے یہاں موجود تھے۔ لیکن دکنی اردو در عمر فارسی کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھی، اس لئے اس میں وہ صفائی، سلاست اور سادگی نہیں آنے پائی تھی جو غزل کی دل نشینی اور اثر آفرینی کا ایک اہم عنصر ہے۔ یہ بات کسی قدر مثنویوں اور قصیدوں کی زبان پر بھی عائد ہوتی ہے۔ یعنی دکھنی شعرا کے الفاظ اور تراکیب میں کسی قدر ناہمواری اور درشتگی پائی جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی اصلاح ہوتی گئی اور ولی کا کلام اس کے آخری دور کا سب سے بہتر نمونہ ہے۔ ولی کے زمانہ تک شمالی ہند میں بھی اردو زبان کا رنگ اور محاورہ خاصا نکھر چکا تھا۔ بلکہ یہ رنگ دکھنی کے نامانوس عناصر سے بھی پاک تھا۔ اسی لئے جب ولی شاہ سعد اللہ گلشن کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا:۔

"شما زبان دکھنی را گزاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلٰی شاہجہاں آباد موزوں بکنید تا موجب شہرت و رواج و مقبول خاطر طبعان عالی مزاج گردد"[1]

ولی نے اس مشورہ پر عمل کیا۔ اور جو رواج اور قبول عام اسکی بدولت ان کے کلام کو حاصل ہوا وہ آج تک تذکروں اور تاریخوں میں موجود ہے۔

ولی کا یہ تجربہ اردو شاعری کی ترقی میں ایک بڑا قدم تھا۔ اور اس سے اس کی

---

[1] تلخیص طبقات شعراء از قدرت اللہ شوق از راقم السطور صفحہ ۹

ترقی کی رفتار میں خاصی تیزی پیدا ہو گئی۔ لیکن بدقسمتی سے اسی وقت ایک اور رجعت پسندانہ تحریک زور پکڑ گئی۔ یہ ایہام گوئی تھی۔ قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں :۔

"بعد از طبقہ شاعران دکن کہ معاصران ولی بودند رواج ایہام بسیار شد"

چند نمونے ملاحظہ ہوں :۔

نمکین حسن دیکھ کر پی کا — رنگ گل کا مجھے لگا پھیکا (محمود شاکر ناجی)
پڑھنے بیٹھا ہے جب سے وہ پیارا — دل ہؤا غم سے سیپارہ "
طبیب عشق سے پوچھا زلیخا نے علاج اپنا — کہا تجھ پہ ضرور ہے سورہ یوسف کا دم کرنا "
لب شیریں سے بے زبانوں کو — بولنا تلخ کام ہے تیرا (مصطفےٰ خاں یکرنگ)
یہی مضمون خط ہے احسن اللہ — کہ حسن خوبرویاں عارضی ہے (احسن اللہ احسن)
من ہرن میرا مزمل رم گیا — دشمنوں کے من کے چیتے ہو گئے (مزمل)

لیکن اُردو کے ترقی پسندانہ جذبات کا ردعمل فوراً شروع ہو گیا۔ اور ایہام گوئی کو ترک کرنے کا جذبہ ہر شاعر میں کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ سلسلہ مرزا مظہر جانجاناں سے شروع ہوتا ہے۔ وہ پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے بقول صاحب طبقات الشعرائے اُردو کو ایہام گوئی کے خارزار سے نجات دلائی اور سادہ اور صاف گوئی کے جوہر سے اپنے کلام کو چمکایا۔ اس سلسلہ کی دوسری کڑیاں سراج الدین علی خاں آرزو، شاہ ظہور الدین حاتم، مرزا رفیع السودا میر تقی میر اور خواجہ میر درد ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کے دم سے دلی میں اُردو کی بزم سخن روشن ہوئی اور اس میں ایسی رونق اور چہل پہل نصیب

ہو گئی جو پھر کبھی نہ ملی، ان کا رنگ وہی ہے جسے رنگ دہلوی کہتے ہیں۔

نمونہ یہ ہے :-

ایسا تجھ بن بھٹکتا ہے میرا دل
کہ کانٹا سا کھٹکتا ہے میرا دل
اُدھر وحشت نے پکڑا ہے گریباں
ادھر دامن جھٹکتا ہے میرا دل
قیامت کشمکش میں آ پھنسا ہے
کہ رو رو سر پٹکتا ہے میرا دل
یکایک ہو گیا ایسا جُدا دل
نہ تھا گویا کبھو یہ آشنا دل
جب آپ سے ہی گزر گئے ہم
پھر کس سے کہیں کدھر گئے ہم
آئے تھے مثال شعلہ سرگرم
جاتے ہوئے جوں شرر گئے ہم
شبنم کی طرح سے اس چمن سے
ہوتے ہی دم سحر گئے ہم
خلق نے مفت میں کیا بدنام
مجھ سے اس سے نہ ہے دُعا نہ سلام
جی دھڑکتا ہے کہ اس فصل خدا خیر کرے
عقل کی قید سے دیوانہ میرا چھوٹا ہے
در و دیوار چمن آج ہیں خوں سے لبریز
دست گلچیں سے مبادا کوئی دل ٹوٹا ہے (حاتم)
سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا (سودا)
کس مُنہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا ״
رخصت اے باغباں کہ تنک دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں ہاں جہاں سے پھر آیا نہ جائیگا ״
چھیڑ مت باد بہاری کہ میں جوں نکہت گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤنگا ״
خوش ہیں شکستہ پائی سے اپنی ہم اس لئے
پرواز کا تو دل سے خلش دور ہو گیا ״
رہ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی
شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا ״
چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا آب رواں سے کام لیا ״

نکلا قید سے دل ہو کر آزاد بہت رویا   لذت کو اسیری کی کر یاد بہت رویا (سودا)
کچھ بن عجب معاش ہے سودا کا ان دنوں ق   تو بھی ٹک اس کو جا کے ستمگار دیکھنا 〃
نے حرف و نے حکایت و نے شعر و نے سخن   نے سیر باغ نے گل و گلزار دیکھنا 〃
خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب   تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا 〃
یا جا کے اس گلی میں جہاں تھا تیرا گزار   صبح تا بہ شام کئی بار دیکھنا 〃
تسکین دل نہ اس میں بھی پائی تو بعد ازاں   پڑھنا یہ شعر گر کبھی اشعار دیکھنا 〃
کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں تجھ کو غیر پاس   پر جو خدا دکھا دے تو ناچار دیکھنا 〃
نہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رخ زرد پر میرے   کہتا ہے میر رنگ تو اب کچھ نکھر چلا (میر)
سودا کے زرد چہرہ کو شوخی کی راہ سے   کہتا ہے تیرا رنگ تو کچھ اب نکھر چلا (سودا)
آتش کو رنگِ گل کی صبا نے تو پھونک تک   جلوائے آشیاں کے مرے خار و خس تمام 〃
بھلا گل تو ہنستا ہے ہماری بے ثباتی پر   بتا روتی ہے کس کی ہستی موہوم پر شبنم 〃
ملائم ہو گئیں دل پر برہ کی ساعتیں کڑیاں   پہر کٹنے لگے اُن بن نہ کٹتیں جن بنا گھڑیاں 〃
نہ غنچے گل کے کھلتے ہیں نہ نرگس کی کھلیں کلیاں   چمن میں لیکے خمیازہ کسی نے انکھڑیاں ملیاں 〃
جس سے پوچھا کہ دل خوش ہے کہیں نکلیں   رو دیا اُن نے اور اتنا ہی کہا کہتے ہیں 〃
ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں   تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں 〃
سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر   اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں 〃
کیفیت چشم اُسکی مجھے یاد ہے سودا   ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں 〃
آلودہ قطرات عرق دیکھ جبیں کو   اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو 〃
اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا   چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا (میر)

اُس کے گئے پر ایسی گئی دل سے ہم نشیں   معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا میرؔ
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے   دل ہوا ہے چراغ مفلس کا ،،
ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا   دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا ،،
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں   تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا ،،
چھوٹا جو میں قفس سے تو سب نے مجھے کہا   بیچارہ کیوں کے تا سرِ دیوار جائیگا ،،
دکھ اب فراق کا ہم سے سہا نہیں جاتا   پھر اس پہ ظلم یہ ہے کچھ کہا نہیں جاتا ،،
نہیں گزرتی گھڑی کوئی مجھ خراب پر آہ   کہ جس میں غم سے ترے جی ڈہا نہیں جاتا ،،
ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا   آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا ،،
بھلا ہوگا کچھ اک احوال اس سے یا بُرا ہوگا   مآل اپنا ترے غم میں خدا جانے کہ کیا ہوگا ،،
وے دن گئے کہ گلشن تھا بود و باش اپنا   اب تو قفس میں بھولے نقشہ بھی گلستاں کا ،،
لے چلی ہے اب تو قسمت تیرے کوچہ سے ہمیں   دیکھئے پھر بھی خدا اس طرف ہم کو لائے گا ،،
تو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں   لگتے لگتے جی قفس میں بھی میرا لگ جائیگا ،،
دل خدا جانے کس کے پاس رہا   ان دنوں جی بہت اُداس رہا ،،
دل جلایا بھڑک جگر اُٹھا   دیکھیو شعلہ یہ کدھر اُٹھا ،،
اس عشق میں جو قدم دھرے گا   جیتا نہ بچے گا وہ مرے گا ،،
ادل سے یہی ہے مجھ کو رونا   آخر کو یہ درد کیا کرے گا ،،
یہی آتا ہے اپنے دل میں پھر پھر   کہ کیا ہوتا جو اپنا دل نہ ہوتا ،،
اس شوخ کے جانب سے عجب حال ہے میرا   جیسے کوئی بھولے ہوئے پھرتا ہے کچھ اپنا ،،
دیکھے سے دور ہی کے دھڑکتا ہے دل ایسا   کیا حال ہوگا جبکہ وہ نزدیک آئیگا ،،

یاں سموم غم سے ہے اب یہ دل کی حالت　　ہو جائے کوئی جیسے ویران باغ جل کر (درد)
جس دن سے اس بزم میں ہشیار ہوا ہوں　　میں سخت اذیت میں گرفتار ہوا ہوں ″
کعبہ میں نہ کافر ہوں نہ بتخانے میں دیندار　　جسطرح کہ میں در پہ تیرے خوار ہوا ہوں ″
حیرت میری طینت میں ہے تخمیر ازل سے　　میں آئینہ سان دیدۂ بیدار ہوا ہوں ″
مجھ کو عاشق کہہ کے اُسکے روبرو مت کیجیو　　دوستو گر دوست ہو تو یہ کبھو مت کیجیو ″
میں تو یونہیں تم سے دیوانہ سا بکتا ہوں کہیں　　آگے اُنکے دوستو یہ گفتگو مت کیجیو ″
لے جائے جیسے غنچہ پژمردہ کو صبا　　یوں آہ لے کے لخت جگر تہ بہ تہ گئی ″

اس نمونہ کلام پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہلوی شعرا کی توجہ عام طور پر قلبی کیفیات اور داخلی جذبات کی ترجمانی پر صرف ہوتی تھی۔ عموماً ایسی کیفیات جو عشق و عاشقی میں دل پر گزرتی ہیں ان شعرا کی غزلگوئی کا موضوع تھیں اور ان کے بیان میں یہ کوشش ہوتی تھی کہ اصلی کیفیت جیسی کہ شاعر کے دل پر طاری ہوئی پڑھنے والا اسے محسوس کرے۔ اسی لئے غزل میں تخیل کا استعمال بڑے اعتدال اور فنکارانہ سمجھ بوجھ سے کیا جاتا تھا سارا زور محاکات پر صرف ہوتا تھا۔ اور چونکہ جذبات کی یہ مصوری الفاظ کے ذریعہ سے کی جاتی تھی۔ اس لئے مضمون کے انتخاب کے ساتھ مناسب زبان اور اندازِ بیان اختیار کرنے کی کوشش ہوتی تھی۔ لیکن اصلی اور بنیادی چیز شعر کا موضوع یا مضمون ہوتا تھا۔ زبان و بیان پر اسی حد تک توجہ کرنا ضروری تھا کہ خیال صاف اور صحیح طور پر ادا ہو جاسکے۔ یہ اسلوب غزلگوئی کا تھا اور کسی قدر مثنوی گوئی کے فنی لوازمات میں بھی اس کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ البتہ مثنوی

کے مخصوص تقاضوں سے بھی عہدہ برا ہونا ضروری تھا۔ مثلاً یہ کہ پوری مثنوی میں شروع سے آخر تک ربط اور تسلسل ہو۔ بیچ میں کہیں کوئی خلا یا کھانچہ نہ رہ جائے۔ ایک واقعہ دوسرے واقعہ کی تکذیب یا تردید نہ کرے۔ کسی نہ کسی حد تک قدرت اور فطرت کے عام قوانین کا لحاظ رکھا جائے اور فوق الفطرت عناصر کے بیان میں اعتدال رکھ کر انہیں صرف اسی حد تک قصہ میں دخل دیا جائے۔ جس قدر کہ واقعی یہ عناصر عوام کے حلقوں میں حقیقت سمجھے جاتے ہوں۔ چاہے از روئے اصل اُن کی اصلیت کچھ نہ ہو۔ مکالمہ نگاری اور جذبات نگاری میں موقع اور محل کا لحاظ رکھا جائے نہ بے جا طول ہو اور نہ بیجا اختصار، مثنوی گوئی کے یہ سارے لوازمات غزل گوئی سے اس قدر قریب آجاتے ہیں کہ اچھا مثنوی گو وہی ہو سکتا ہے۔ جس میں غزل گوئی کی صلاحیت موجود ہو۔ میر تقی میرؔ۔ میر حسنؔ۔ نسیمؔ۔ شوقؔ اور فلقؔ کی مثنویاں اس کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے اچھا قصیدہ گو اچھا مثنوی گو نہیں ہوتا۔ مرزا، سوداؔ کی مثنویوں کے بارہ میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا یہ قول

”مرزا در مثنوی فکر معقول نہ داشت“

صحیح معلوم ہوتا ہے، کہتے ہیں ایک دفعہ میر انیسؔ نے بھی مثنوی لکھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن دادا جان کی مثنوی پڑھی۔ اور خیال ترک کر دیا۔

قصیدہ گوئی کا اسلوب اس سے مختلف ہے اوّل تو قصیدہ کے لئے خاص قسم کے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ درباری شان و شوکت، اطمینان

اور فارغ البالی اس کے بنیادی لوازم ہیں۔ شاعر بھی ایسا ہی چاہیے جس کے تخیل میں بلند پروازی اور بیان میں طنطنہ ہے۔ مرزا سودا اور کسی قدر ذوق کا یہی انداز ہے۔ یوں کہنے کو اور تمام شعراء نے باستثنائے میر درد ضرورتاً تقلید سے کہے ہیں۔ لیکن یہ اُن کے اصلی رجحان طبع کو ظاہر نہیں کرتے۔

یہاں دہلوی رنگ کے دو اور عناصر کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ سوز و گداز اور تصوف۔ سوز و گداز دلی کے اُن مخصوص سیاسی، اقتصادی، تمدنی اور معاشرتی حالات کا نتیجہ ہے۔ جن کا کچھ ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس میں مزید شدت شعرا کے ذاتی حوادث نے پیدا کی۔ میر تقی میر اس کی ایک مثال ہیں وہ جب یہ کہتے ہیں کہ ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان ہو

یا

جہاں سے دیکھیے ایک شعر شور انگیز نکلے ہے قیامت سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیوان میں

تو وہ اپنے ساتھ اپنے تمام معاصرین کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہی ماحول تصوف کے فروغ کا باعث ہوا۔ اور دنیاوی لذتوں سے محروم ہو کر شعرا نے صوفیوں کے حلقوں اور خانقاہوں میں تزکیہ نفس اور روحانی آسودگی کی تلاش کی اور اس طرح اُن کے کلام میں وہ عارفانہ رنگ پیدا ہوا۔ جو اپنی پوری آب و تاب سے خواجہ میر درد کے دیوان میں جلوہ گر ہے۔ لیکن جس کی کرنیں تمام دہلوی شعرا کے کلام میں کمتر یا بیشتر جھلکتی ہیں۔ اس طرح

تغزل کے مفہوم میں [illegible] بڑی وسعت پیدا ہوگئی۔ عشق مجازی کے محدود دائرہ اور رنگین مزاجوں کی حرف و حکایات سے نکل کر غزل گوئی نے عشق حقیقی کے مختلف مظاہر اور مدارج کو اپنے احاطہ میں لے لیا، اسی سے حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات کا غزلوں میں فروغ ہوا جس کا ورثہ غالبؔ سے لیکر اقبال تک سب کو بقدر ظرف پہنچا ہے[1]

بعض ناقدین نے دہلوی رنگ کی تمام خصوصیات کو "داخلی رنگ" "SUBJECTIVE POETRY" کہہ کر ظاہر کیا ہے۔ نواب امداد امام اثرؔ نے کاشف الحقائق میں دہلوی اور لکھنوی رنگ کے فرق کیلئے داخلی اور خارجی یعنی OBJECTIVE اور SUBJECTIVE کی اصلاحیں استعمال کیں۔ اور اس وقت سے عام طور پر دہلوی اور لکھنوی شاعری کی تنقید میں ان کا برابر استعمال ہوا ہے۔ داخلی سے مراد ہے کہ شاعر قلبی کیفیات اور داخلی جذبات کی ترجمانی پر زور صرف کرتا ہے۔ اس کے برخلاف خارجی رنگ میں متعلقات حسن اور خارجی لوازمات پر طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ اگر ان کیفیات کی مصوّری کی جائے۔ جو حسن کی دید سے یا فراق سے دل پر گزریں، تو یہ داخلی رنگ میں داخل ہوگا اور اگر محبوب کے خدوخال اس کے جسم کے مختلف اعضاء، ملبوسات، زیورات اور سنگھار کا بیان ہو۔ تو اسے خارجی رنگ قرار دیتے ہیں۔

اس حیثیت سے دیکھیں تو دہلوی رنگ کا خالص داخلی کہنا دشوار ہے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو لکھنؤ کا دبستان شاعری از راقم السطور۔

متعلقات حسن کا ذکر دہلوی شعرا نے کیا ہے۔ اور خوب کیا ہے۔ مثلاً

پہنچے نہ حلاوت کو بھی اُسکے دہن کی　　قند نے کہ پستہ کو شیرینی میں پایا (سودا)
نقص تیرے وسعت دہنا گوشش کا　　اپنے سخن کو تو گہر کر گیا 〃
حنا کی کا پسر بھی مسیحا سے کم نہیں　　فیروزہ ہوئے مردہ تو دیتا ہے وہ جلا 〃
دندان و لب پہ پیارے تھا نیم جاں میں لیکن　　مستی دو انگلی ڈال کر کھایا جو پان مارا 〃
کوتہ ہوا ہے قضیہ خط آنے سے یار سے　　کہلوا کے ہم نے زلف کو ناحق بڑھائی بات 〃
خط اسکے آنے پر بھی وہ ملتا نہیں ہے سینہ صاف　　گرد سے ہوتا تو ہے یارب ہر ایک آئینہ صاف 〃
جب لبوں پہ یار کے مسی کی دھڑیاں دیکھیاں　　جیوں زحل کے ساتھ میں اس لب پہ کڑیاں دیکھیاں
داغ چیچک سے بتلاتے تھے اختر سے تمیز　　چتیاں سے ہم نے اُس مکھڑے جڑیاں دیکھیاں
وہ نہانے لگا تو سایۂ زلف　　بحر میں تو کہے کہ جال پڑا (امیر)
وہ اک روش سے کھولے ہوئے بال ہو گیا　　سنبل چمن کا مفت میں پامال ہو گیا 〃
گل شرم سے بہ جائیگا گلشن میں ہو کر آب سا　　برقع سے گر نکلا کہیں چہرہ ترا مہتاب سا 〃
پلکوں سے تیری ہم کو کیا چشم داشت یہ تھی　　اُن برچھیوں نے یارا چھانا جگر ہمارا 〃
روئے عرق فشاں کو پونچھ گرم مت ہو　　اس گل میں کیا بہیگا جس کا گلاب نکلا 〃
اس کی کنجی زبان شیریں ہے　　دل مرا قفل ہے بتاشے کا (امیر)
لب شیریں پہ اسکے مرتا ہوں　　زندگی اپنی تلخ کرتا ہوں (امیر سجاد)
کیا بدن ہوگا کہ جسکے کھولتے جامہ کے بند　　برگ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا (یقین)

ایسے اشعار تلاش سے تقریباً ہر دہلوی شاعر کے یہاں کثرت سے نکل آئیں گے۔ اس سے دہلی کے رنگ کو داخلی اور لکھنؤ کے رنگ کو خارجی نوعیت

کے اعتبار سے نہیں مقدار کے اعتبار سے کہہ سکتے ہیں۔ خالص لکھنوی رنگ تو مصحفی کے بعد جما۔ ناسخ۔ آتش اور اُن کے تلامذہ نے اسے فروغ دیا۔ لیکن لکھنویت کے آثار کچھ کچھ ان لوگوں کے کلام میں بھی راہ پا گئے ہیں جو دہلی سے ہجرت کر کے فیض آباد اور لکھنؤ آئے تھے۔ مصحفی بھی اسی سلسلہ میں ہیں اس لکھنوی رنگ کا بھی کچھ ذکر کرنا ضروری ہے لکھنؤ کی شاعری پر سب سے پہلا اثر لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کا پڑا۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ جسے سحر نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو
ہر اک خانہ شادی ہے ہر اک کوچہ ہے عشرت کا

اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ سوز و گداز کا وہ ماحول جو دہلی کے شعرا کو ملا تھا۔ یہاں بدل گیا دوسرے دولت کی فراوانی اور فضائے تعیش نے اور آزادی کی راہ دکھائی نمائش بینی پر لوگ فخر کرنے لگے۔ شجاع الدولہ کے متعلق فیض بخش کاکوروی نے تاریخ فرح بخش میں اپنا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے کہ انہیں فطرتاً عورتوں کی صحبت پسند تھی۔ لہذا بازاری عورتیں اور اُن کے گانے والے طبلچی اس قدر کثرت سے تھے۔ کہ کوئی محلہ یا کوچہ ایسا نہ تھا۔ جہاں وہ موجود نہ ہوں۔ اور مالی اعتبار سے ان کی حالت ایسی اچھی تھی کہ ان میں اکثر ڈیرہ دار تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ دو دو تین تین خیمے رہا کرتے تھے۔ نواب وزیر جب اضلاع کا دورہ کرتے تھے تو ان کے ڈیرے بھی ساتھ چلا کرتے تھے اور دس بارہ تلنگے ان کی حفاظت کے لئے ساتھ ہوتے تھے اسی وجہ سے فوجی حکام اور امرا بھی علانیہ بلا خوف رسوائی اپنے داشتے

ملک اور آقائے نعمت کی تقلید کرتے تھے، گویا یہ ایک حمام تھا جس میں سب ننگے ہو گئے تھے۔ سوائے ایک امجد علی شاہ کے جو خود بڑے مذہبی آدمی تھے سارے رئیس اسی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔ یہ اُس سوانگ کی ابتدا تھی جس کی انتہا قیصر باغ کے رنگیلے پیا جانِ عالم واجد علی شاہ پر ہوئی۔ قدرتی طور پر یہاں کا ابتدائی شعر و ادب کا سرمایہ بھی اسی میلان کا آئینہ دار ہے۔ جذبات کی پاکیزگی اور بیان کی متانت جو دہلوی شاعری کا ایک امتیازی نشان تھی یہاں عنقا ہے۔ اس کی جگہ ایک نئے فن نے لی۔ جس کا نام معاملہ بندی ہے۔ اور جس میں عاشق اور معشوق کے درمیان پیش آنے والے واقعات درون پردہ کو کھول کر بیان کیا جاتا ہے۔ ایسے اشعار پہلے بھی خال خال دہلوی شعرا کے کلام میں ملتے ہیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے۔ کہ اس فن میں جرأت پیش پیش ہیں۔ اور وہ دلّی سے آئے تھے۔ لیکن اُن کے مذاق کی تسکین میں لکھنؤ کی فضا کو بڑا دخل ہے۔ جس کے ماحول نے اس کا موقعہ دیا کہ وہ اپنے پست جذبات کو نظم کریں اور داد پائیں۔ چنانچہ جرأت اور ان کے ساتھ ان شاعروں کی گل فشانی دیکھئے جن پر لکھنؤ کو ناز ہے[1]:۔

کل واقف راز اپنے سے وہ کہتا تھا یہ بات
جرأت کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم
کیا جانئے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم (جرأت)
رات کو چوری چھپے پہنچا جو میں
غل مچایا اس نے دوڑو چور ہے (ناسخ)

---

[1] ماخوذ از لکھنؤ کا دبستانِ شاعری از راقم السطور صفحہ ۵۵، مشرقی تمدن کا آخری نمونہ شرر، گل رعنا، عبدالحی۔

کھولئے شوق سے بند انگیا کے — لیٹ کے ساتھ نہ شرمائیے آپ (رند)
ہاتھ میں انگیا کی چڑیا آ گئی — آج ہم عنقا کو لائے دام میں (مسیح)
کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت — ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت (انشا)
مستی میں میں لگا ہی چکا تھا اسے گلے — بہکا جو پاؤں ہاتھ کمر سے نکل گیا (امانت)

اس معاملہ بندی سے قطع نظر اس ماحول میں قدرتی طور پر شاعری کے عام رنگ میں رکاکت اور ابتذال سرایت کر گئے۔ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو اگر انیس، دبیر، محسن اور ان کے رفیق نہ روکتے تو نہ معلوم شعر و شاعری کا کیا انجام ہوتا۔ اس سلسلہ میں نسائیت کا عنصر بھی شعر و ادب کا جزو بن گیا۔ شاعری کا سب سے بڑا موضوع ہر قوم، ہر زمانہ اور ہر زبان میں عورت ہی رہی ہے۔ بلکہ اگر عورت کو شاعری کا مرکز یا محور کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ فارسی میں اگرچہ محبوب کے بیان میں ترکانہ حسن اور صفات کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ظاہر ہے عورت کا ہی فطری عشق مرد کے شاعرانہ جذبات کو بھڑکا سکتا ہے۔ ہندی شاعری میں اس آگ کو اور بھڑکانے کے لیے عشق کا اظہار عورت کی زبان سے کرایا گیا ہے۔ اور مرد کو اس کا مطلوب قرار دیا ہے۔ قدرتی طور پر عورتوں کے جذبات اور اُن کی زبان، ان کا اسلوبِ بیان اور لب و لہجہ شاعری کے سرمایہ میں ایک اہم عنصر ہوگا۔ ابتدا میں اُردو شعرا نے بھی اس طرف توجہ کی چنانچہ دکنی دور میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ شمالی ہند میں افضل جھنجانوی (المتوفی سنہ ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء) کا مشہور بارہ ماسہ بھی اسی قبیل کا ہے۔ شجاع الدولہ کے عہد سے حسین اور مہ جبیں عورتوں کو محلات کے علاوہ عام سوسائٹی میں بڑا

داخل ہو گیا۔ اگر یہ عورتیں پاک دامن، عصمت مآب ہوتیں تو سوسائٹی اور ادب، دونوں پر ان کا اثر بڑا صحتمندانہ ہوتا۔ لیکن یہ بازاری عورتیں تھیں جو صرف نفس حیوانی کو مشتعل کرتی تھیں، ادھر عیش و عشرت اور فراغت نے مردوں کو مردانہ خصائل سے محروم کر کے ان کے مردانہ جذبات اور خیالات کو کمزور کر دیا۔ اور نتیجہ یہی ہوا کہ مردوں کے جذبات، خیالات اور زبان پر نسائیت غالب آ گئی۔ ریختہ کے جواب میں ریختی تصنیف ہوئی اس کی ایجاد کا سہرا انشاؔ نے سعادت یار خاں رنگینؔ کے سر رکھا ہے۔ لیکن اس کے بعض نمونے ان سے پہلے بھی ملتے ہیں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اسے بطور فن سب سے پہلے رنگینؔ نے ہی اختیار کیا۔ اور پروان چڑھایا۔ بعد میں انشاؔ اور دوسرے شعرا بھی اس میں شامل ہو گئے۔ ریختی کے ان نمونوں میں عورتوں کے فاحشانہ جذبات کو ان کے خاص محاورہ میں جس طرح ان لوگوں نے نظم کیا ہے۔ وہ لکھنؤ کی سوسائٹی اور شاعری کے دامن پر نہ مٹنے والا داغ بن کر رہ گئے ہیں۔ اس کا روشن پہلو اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ اس طرح لکھنؤ کی بیگماتی زبان کے مخصوص محاورے اور ان کا انداز گفتگو محفوظ رہ گیا۔ اور لسانیاتی نقطہ نظر سے اس کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی۔

اسی لکھنوی فضا کا ایک اہم رخ آزادی تھا۔ نواب وزیر نے دلی کے دربار سے آزادی حاصل کی اور آخرکار انگریزوں کی تحریک پر سلطان کا لقب بھی اختیار کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ والوں نے ہر شئے میں خود کو دلی کی سیاسی

ذہنی اور معاشرتی قیادت سے آزاد کر لیا۔ تہذیب و تمدن اور معاشرت کے نئے اصول مدون ہوئے۔ لباس، وضع اور قطع میں نئی نئی تراشیں اور خراشیں ہوئیں، آداب مجلس اور گفتگو میں فرق قائم ہوا۔ چنانچہ ادیب اور شاعر بھی شاعری کے مروجہ اور مستعملہ اصولوں اور اسالیب سے انحراف کرنے لگے۔ اس میں ایک طرح کی دلی والوں کی ضد اور مقابلہ کا جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ وہاں شاعری جذباتی اور داخلی تھی۔ تو یہاں لفظی اور خارجی ہو گئی۔ وہاں عین عالم فطرت تھا تو یہاں کمال صنعت معیار سخن ٹھیرا، وہاں سادگی اور برجستگی تھی تو یہاں تکلف اور تصنع کو دخل ہوا۔ اور زبان میں ایسی تراش خراش کی اور اس کے اصول و قواعد منضبط کیے جو اس سے پہلے موجود نہ تھے۔

ان سب کا تاریک پہلو تو یہ تھا۔ کہ "اثر آفرینی" جو متقدمین شعرائے دکن اور دلی کے کلام کا خاصہ ہے۔ رفتہ رفتہ نظر انداز ہو گئی۔ لیکن اس سے زبان نے ایک نئی صورت اور صفائی پائی اس سلسلہ میں دلی مرزا مظہر حاتم اور سودا کے ساتھ ناسخ کا نام بھی اُردو زبان کے معماروں کی فہرست میں شامل ہوتا ہے۔ ناسخ اور ان کے شاگردوں اور معاصرین بالخصوص رشک اور جلال نے تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کئے اور بڑی سختی سے ان کی پابندی کی ناسخ کو واقعی اس بارہ میں اُردو کا ناسخ کہنا چاہیئے۔ اور بقول نواب امداد امام اثر اگر شیخ ناسخ کو اس وقت اُردو زبان کی اصطلاح کی طرف توجہ کا موقع نہ ملتا تو اُردو کو اپنی موجودہ شکل تک پہنچنے میں مدتیں درکار ہوتیں

یہ کارنامہ لکھنوی شعرا کا اُردو کی تاریخ میں ایک اہم اور یادگار واقعہ ہے جس کا
اعتراف دلّی والوں نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ شاہ نصیر کو دلّی والے اپنا ناسخ
کہتے ہیں۔ غالبؔ اور مومنؔ دونوں نے اپنی مشق کے ابتدائی ایام میں
شاہ نصیر کے رنگ کو اختیار کیا تھا۔ کیونکہ ظفرؔ خود اس رنگ کو پسند کرتے تھے اور
ان کی وجہ سے عام طور پر دلی والے اسے اختیار کرنے لگے تھے۔

لکھنؤ کی فضا کا ایک اور اہم عنصر تکلف پسندی تھا یہی وجہ ہے
کہ لکھنوی حضرات آج تک اپنے تکلّف کے لئے سارے ہندوستان
میں ضرب المثل ہیں۔ شعر و ادب میں بھی تکلف ان کے ماحول کی ترجمانی کرتا
ہے۔ اس کی ایک مثال رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب اور اُن کے
رُقعات میں ملتی ہے۔ فسانۂ عجائب کو میر امّن کی باغ و بہار کا جواب سمجھنا
چاہیئے۔ میر امّن نے اپنا قصّہ سادگی اور سلاست سے بیان کیا ہے۔ جسے سرور
نے محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑنا بتایا ہے۔ سرور کی اپنی عبارت نہایت
پُر تکلف اور بے شمار صنائع لفظی اور معنوی سے گرانبار ہے۔ یہی حال لکھنوی
شاعری کا ہے جہاں شعرا نے شعر کے ظاہری پیکر پر توجہ زیادہ صرف کی ہے۔ اسی
کے پیشِ نظر دہلوی اور لکھنوی رنگ کے فرق کو ایک ناقد نے "اُردوئے معلّٰی"
اور "اُردوئے معلیٰ" کہہ کر ظاہر کیا ہے۔ شاعری اور صنعت گری، جذبات نگاری
اور الفاظ کی شعبدہ کاری کو باہم ملا کر جو نیا رنگ پیدا ہوا۔ اس کی ایک شکل
رعایت لفظی اور ضلع جگت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ تشبیہہ اور
استعارہ میں سادہ اور نیچرل انداز کی جگہ تشبیہہ در تشبیہہ یا استعارہ در استعارہ

نے لی یا پھر تشبیہوں کے اجزا کی تحلیلی ترکیب پر توجہ صرف ہونے لگی۔ خیال آفرینی پر زیادہ زور ہوا اور یہ کبھی تو محسوس اشیا کے سلسلہ میں تخیل کی بلند پروازیوں میں صرف کی جاتی تھی۔ اور کبھی محض وہمی مسائل پر۔ آخرالذکر میں کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مثال بالکل صادق آتی ہے اب نمونہ دیکھئے:

رعایت لفظی :-

یادِ دُرِ دنداں میں مری جان گئی ندتہ — تقدیر نے کشتہ کیا ہیرے کی کنی کا
وصل کی شب پلنگ کے اوپر — مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں
کہیں جو میٹھی نظروں سے وہ دیکھے — کہوں آنکھوں کو میں بادام شیریں
نہ دکھلایا کبھی دن بوند بھر پانی پسینے نے — ترا چاہِ ذقن اے جانِ جاں اندھا کنواں نکلا
ساری رگیں ہوئی تن زار پر نمود — بے طاقتی نے جسم کو مسطر بنا دیا
نہ بیں اے گردشِ آسماں — کہ ہر استخواں کا روا ہو گیا
دل دیکھ اسے کس کا ناشام نہیں پیتا — پر چشمِ سیاہ کا یہ بادام نہیں پیتا
کر خط سے بوسہ لبِ شیریں ذرا نہ ترک — قند و نبات میں نہیں ہوتا ہے بال کیا
قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت — بعد مرنے کے میری تو قبر آدھی رہ گئی
مرغِ جاں کو توڑیگی بلی ترے دروازے کی — رخشِ تن کو کاٹے گا چوہا تمہاری ناک کا
ہندو پسر کے عشق کا کشتہ ہے باغباں — لالہ کا پھول رکھنا امانت کی گور پر

خارجی متعلقاتِ حسن :-

پاس کے روتی ہیں تالے ہوئے تاباں آفتاب — تیرے آنے سے ابھی بام آسماں ہو جائیگا
اس نے جو پونچھا پسینہ روئے عالمتاب کا — بن گیا رومال کو تہ چادرِ مہتاب کا

لکھوں کیا حال میں دیوانہ اپنی ناتوانی کا   ہوا طوق گراں گردن میں وہ چھلا انگشتانی کا
دمکتا ہے جو کندن سا بدن ہر ایک حلقے سے   ترشحا جالی کی کرتی میں ہے عالم کا بدانی کا
بندے کانوں میں نہیں تعویذ بازو میں نہیں   وہ ستارہ صبح کا ہے یہ ستارہ شام کا
کس قدر صاف ہے تمہارا پیٹ   صاف آئینہ سا ہے سارا پیٹ
پہنے کرتی اگر وہ جالی کی   کرے ہر حلقہ کو ستارا پیٹ

مصحفی کے کلام کا مطالعہ اسی ادبی اور شاعرانہ ماحول کے پس منظر میں مکمل ہو سکتا ہے۔ دہلوی اور لکھنوی رنگ کی یہ تفصیلات یوں اور بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہیں۔ کہ مصحفی ان دونوں رنگوں میں ایک عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

غزل کا مخصوص موضوع عشق و عاشقی کی کیفیات اور واردات کی ترجمانی ہے۔ چنانچہ مصحفی نے بھی اپنی غزلوں میں انہی مضامین کی طرف خاص توجہ کی ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے ہم ان غزلوں کو لیتے ہیں جن میں داخلی شہادت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کلام دلّی کا ہے۔ یا جن میں زبان و بیان خالص دہلوی رنگ ظاہر کرتے ہیں:۔

یہ دلّی کا نقشہ سنوارا زمیں پر   کہ لا عرش کو یاں اُتارا زمیں پر
قسم ہے سلیمان کی پیشِ زماں میں   نہیں پریوں کا تھا گذارا زمیں پر
ہیں وہ سنگِ راہ ہوں کہ جو ٹھوکروں میں   پھرے سر طرف مارا مارا زمیں پر
فلک سے جو اپنے تئیں دور کھینچا   یہ حرکت ہوئی ناگوارا زمیں پر
چلا تب وہ مجلس سے اُٹھ کر جو وہیں   قیامت ہوئی آشکارا زمیں پر

گیا ہاتھ سے دل جو میرا تو پھر وہ   پھر اوٹھا جیسے پارا زمیں پر
کوئی مصحفی کو اُٹھاتا نہیں ہے   نظر کیجو ٹک خدارا زمیں پر

•

کیا وصل کی شب کا میں کہوں رات کا عالم   وہ رات تھی یا رب کہ طلسمات کا عالم
وہ چاندنی رات اور وہ ملاقات کا عالم   کیا لطف میں گذرا ہے غرض رات کا عالم
وہ کالی گھٹا اور وہ بجلی کا چمکنا   وہ مینہ کی بوچھاڑیں وہ برسات کا عالم
اے مصحفی چل تو بھی قطب کو کہ کہے ہیں
آتا ہے بہت چھڑلوں میں میوات کا عالم

بسمل نے وقت ذبح گر آنکھیں کھولیاں   رخصت وہ تیرے خنجر مژگاں سے ہو لیاں
عاشق پہ برچھیاں تری مژگاں سے بولیاں   یہ کشتنی نہیں وہ نگاہیں نہ بولیاں
محتاج عطر کب ہے وہ پیراہن کتاں   جوش عرق سے جن کی مہکتی ہیں چولیاں
محروم رنگ گل سے نہ رکھ اب تو باغباں   گلچین سے گل اُترتے ہیں بھر بھر کے جھولیاں
نرگس نے گل کی دید کو آنکھیں جو کھولیاں   کچھ جی میں جو سمجھ گئیں کلیاں نہ بولیاں

ان غزلوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مصحفی کی شاعری کا آغاز دلی میں ہو چکا تھا۔ بلکہ ان کے اپنے قول کے مطابق ایک دیوان بھی مرتب ہو گیا تھا۔

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں   دلی ہی میں چوری میرا دیوان گیا تھا

اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ موجودہ کلام کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں لکھا گیا اور مرتب ہوا۔

اس کلام میں سب سے پہلے عاشقانہ رنگ کا نمونہ دیکھیے۔ مصحفی کی افتاد طبع

ذاتی حوادث اور واقعات سیاسی، اور معاشرتی ماحول نے طبیعت میں جو سوز و گداز پیدا کر دیا تھا۔ وہ عاشقانہ رنگ کی لے کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسی لئے مصحفی کے کلام میں بھی میر تقی میر کی طرح ایک ایسے عاشق کے جذبات نظم کئے گئے ہیں جو ہمیشہ محروم رہا۔ جس کی قسمت میں مسکراہٹوں کی جگہ ہجر کی تلخیاں لکھی تھیں جس نے آسودہ نشیمن ہو کر بہاروں کا لطف لوٹنے کی جگہ قید قفس اور بیداد باغباں سہہ سہہ کر زندگی گزاری ہو۔ کہنے کو لوگ کہتے ہیں کہ جب مصیبتیں پے در پے نازل ہوں۔ تو سہنے والے کو بھی ان کی عادت سی ہو جاتی ہے۔ اور بقول مرزا غالب مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں، لیکن رنج کا خوگر ہونا آسان بات نہیں مصحفی ہجر کے ان صدموں کو اُٹھاتے رہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ ان کی شدت سے تڑپ بھی اُٹھتے ہیں۔ ؎

عشق کے صدمے اُٹھائے تھے بہت پر کیا کہیں اب تو ان صدموں سے کچھ جی اپنا گھبرانے لگا

وہ صدموں کی نوعیت یا شدت کا اظہار کرتے کے لئے تفصیلات سے کام نہیں۔ لیکن ان کا صرف یہ کہنا کہ اب تو ان صدموں سے کچھ جی اپنا گھبرانے لگا ایک ایسی تصویر پیش کر دیتا ہے جو پھر کسی رنگ آمیزی کی محتاج نہیں رہتی اس کیفیت کا وہ پہلو جس کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا اور جو مرزا غالب نے نظم کیا۔ اسے بھی مصحفی نے اپنے خاص انداز میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

کنجِ قفس میں لطف ملا جس کو وہ اسیر چھوٹا بھی گر تو پھر نہ سوئے آشیاں گیا

اس شعر میں یاس و حسرت کی جو انتہا ہے وہ مصحفی ہی کا حصہ ہے۔

ہماری قدیم شاعری کی علامات یعنی استعاروں میں "مرغِ اسیر" بظاہر

فرسودہ اور پیش پا افتادہ ہے۔ لیکن مصحفی نے اپنی زندگی، اپنی آرزوئیں اور تمنائیں، حسرتیں اور ناکامیاں سب اسی ایک استعارہ میں کس کس طرح کی ادا کی ہیں:- ؎

کنج قفس میں جو کوئی مر گیا　　ظالم بسیاراں دگر کر گیا
رہتے ہیں ساکنان قفس منتظر ترے　　بادِ صبا ادھر بھی گزر گاہ گاہ کر
زیر دیوارِ چمن ذبح مجھے کر صیاد　　شاید اُڑتے ہوئے یہاں میرے پر جائیں کہیں
تھی گرفتاری میں بھی اک لذتِ آسودگی　　کیا کہیں ہم کتنے پچھتائے نکل کر دام سے
نہ غنچہ لائی گل ارمغاں کبھی افسوس　　ہمیں قفس میں نسیم بہار بھول گئی
جب فصل گل قفس میں گرفتار ہم ہوئے　　یہ جی کُڑھا کہ زیست سے بیزار ہم ہوئے
قفس سے چھوڑے تو اب تو ہم کو اے صیاد　　چمن میں کہتے ہیں پھر موسم بہار ہوا
فصل گل فصل خزاں دونوں گئیں اے صیاد　　مرغ دل کونسے موسم میں رہا ہو دیگا
کنج قفس میں دیکھ کے کہتی ہے مجھ کو خلق　　اس مُرغ کو بھی حسرت پرواز ہے سُنو
کنج قفس سے چھوٹ کے پہنچا نہ باغ تک　　حسرت یہ جی میں مرغ گرفتار لے گیا
گویا اسے خبر ہے کہ آئی بہار گل　　ٹک اضطراب مرغ قفس زاد دیکھیو
اول تو قفس کھولے در باز کہاں ہے　　اور ہو بھی تو یہاں طاقت پرواز کہاں ہے
رہے گردش میں یہی جبتک رہے پرواز میں ہم　　چمن آتے ہی تہ دام بہت سا پایا
کنج قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر　　فصل بہار باغ میں دھومیں مچا گئی
رہے اسیر قفس سالہا ہزار افسوس　　نہ دیکھی ایک بھی فصل بہار ہم نے تو

یہ سارے مضامین جو ایک "اسیر قفس" کے استعارہ کے محور پہ گردش کرتے ہیں

مصحفی کی مضمون آفرینی اور اثر آفرینی دونوں کو واضح کرتے ہیں بعض کیفیتوں کو صرف الفاظ کے برمحل استعمال نے اثر کی اعلیٰ منزل پر پہنچا دیا ہے۔ مثلاً:۔

ع۔ یہ جی رندھا کہ زیست سے بیزار ہم ہوئے

جو کیفیت "رندھا" سے ظاہر ہوتی ہے وہ اور کسی طرح ممکن نہیں۔

"مرغِ اسیر" کے استعارہ کو اگر ذرا اور وسعت دے کر صرف "مرغ"۔ چمن صیاد۔ بہار، خزاں کو علیٰحدہ علیٰحدہ کر کے دیکھئے تو اس سے ہزاروں اور مضامین پیدا ہو سکتے ہیں۔ صرف چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بلبل کا آشیانہ جس دن جلا چمن میں   کہتے ہیں آتشیں تھی اُس دن ہوا چمن میں
مجھے رحم آئے ہے حسرت پہ آہ اس مُرغِ بے پر کی   کہ اُڑ سکتا نہ ہو اور ہو بزیرِ آشیاں بیٹھا
یاس کو اس بُلبل بے پر کی دیکھا چاہیئے   آتشِ گل جس کے کچھ اک آشیاں سے دور ہو
قصہ دردِ غریبی اُس سے پوچھا چاہیئے   موسمِ گل میں جو اپنے آشیاں سے دور ہو
آتشِ گل بھڑکیو بچ کے ذرا   باغ میں آشیاں ہزاروں ہیں
بلبل کا باغباں سے اب کیا نشاں پوچھوں   بیرونِ در چمن کے اک مُشت پر پڑے ہیں
اپنی تو اس چمن میں نت عمر یوں ہی گزری   یہاں آشیاں بنایا وہاں آشیاں بنایا
سیرِ چمن کی نہ دلا ہم کو یاد   وہ بھی دن اے بادِ صبا ہو گئے
رشک ہے اوقات پر ان کی مجھے   موسمِ گل میں جو رہا ہو گئے

جو لوگ متقدمین شعرائے اُردو کے کلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے یہاں سوائے گُل و بُلبل کے اور رکھا کیا ہے۔ اُن کے لئے ایسے اشعار کا مطالعہ ضروری ہے مصحفی کے یہ پچیس اشعار جو نقل ہوئے کلیات کے سرسری مطالعہ سے منتخب

ہوئے ہیں۔ کیا ان سے ہمیں مصحفی کے ماحول، اُن کی زندگی۔ ان کی قلبی کیفیات اور داخلی جذبات کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ اور کیا یہ اشعار مضمون کی تازگی اور ادا کی جدت دونوں کے اعتبار سے باوجود فرسودہ، استعاروں کے استعمال کے شاعری کا نادر نمونہ نہیں ہیں

اس رنگ میں ایک اور خاص لے، درد اور سوز و گداز کی ہے۔ معلوم نہیں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو یہ شکایت کس طرح پیدا ہوئی۔ کہ "درد و گداز، جوش و خروش، نزاکت و لطافت، تخیل، برجستگی و بیساختگی کے جوہر عطیہ فطرت ہوتے ہیں، مشاقی و پرگوئی، کسب و اکتساب سے اس محرومی کی تلافی نہیں ہو سکتی"[1] ہمارے خیال میں تو یہ سارے عناصر مصحفی کے کلام میں ملتے ہیں۔ اشعار بالا کے علاوہ کچھ اور نمونے درد و گداز کے دیکھئے:۔

جز آہ وہاں کوئی کرے کیا   کچھ بس نہ چلے جہاں کسی کا
اے مرغ چمن یہیں نہ کر شور   میراث ہے گلستاں کسی کا
تا فصل دگر رہا نہ ہرگز ق اس باغ میں آشیاں کسی کا

●

ہے جائے رحم حال پہ یہاں اس اسیر کے   جو گرتے ہی ہوا سے تہ دام آگیا
شبنم کو کیا میں روؤں کہ اس گلستاں کے بیچ   جو گل کھلا سو کھلتے ہی کافور ہو گیا

●

---

[1] مقدمہ مثنوی بحر المحبت صفحہ ۱۷

رہا ہے کون عالم میں سدا عالم یہ فانی ہے
گر اُٹھ جاوینگے ہم بھی ایکدن عالم سے کیا ہوگا

•

درد و غم کو بھی ہے نصیب یہ شرط
یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا
دُنیا ہے سرائے فانی اس سے
چلیئے کہ مقام ہو چکا اب
جسکی جسطرح کٹی غمکدہ ہستی میں
عمر اپنی کی وہ اوقات بسر کر ہی گیا
رونے پہ مرے جو تم ہنسو ہو
یہ کونسی بات ہے ہنسی کی

•

پایا نہ اس چمن میں کسی نے لباس عیش
جو گل گیا سو خون میں ڈبا بہار لے گیا
آیا جو یاں سو وہیں بہانے سے اُٹھ گیا
آسودگی کا حرف زمانے سے اُٹھ گیا
کوئی اس مجلس میں ہرگز داد غم دیتا نہیں
شمع سے کہدو کہ تیری اشکباری ہے عبث
غنچہ ادھر مسکراتا ہے ادھر ہنستا ہے گل
اس چمن میں گریہ ابر بہاری ہے عبث
بہار آئی خدا جانے کہ کیا گذرا اسیروں پر
نہیں معلوم کچھ اب کی برس احوال زنداں کا
میرا جی جانتا ہے یا میں اسے جانوں ہوں
جو غم گزرے ہے مجھ پہ میرے غمخوار دل مت پوچھ
حسنی کا شعر ہے یہاں مصحفی کیا حسب حال اپنے
سنو تم ہم سے اسکو خانماں بربادوں سے مت پوچھو
گئے وے دن جو بستے تھے جہاں آباد میں ہم بھی
خرابی شہر کی صحرا کے آواروں سے مت پوچھو

•

عبث تو آشیاں بلبل کا اے صیاد لوٹے ہے
کوئی یوں بھی کسی کا خانہ آباد لوٹے ہے
صبا کے ہاتھ سے یوں گل لُٹا ہوگا نہ گلشن میں
فلک جسطرح سے کرکے ہمیں برباد لوٹے ہے
پھنسا ہو جسکا دل گلشن میں کیا وہ ذوق قفس سمجھے
گرفتاری کی لذت طائر آزاد لوٹے ہے

گلہ پوشوں نے یوں غارت کیا اس کشور دل کو	کہ جیسے فوج شاہ آ کے جہاں آباد لوٹے ہے

•

کبھو تاک کے در کو کھڑے رہے کبھو آہ بھر کے چلے گئے	ترے کوچہ میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے
یہ عجب زمانہ کی رسم ہے کہ جنھوں پہ مرتے تھے ہم سدا	پس مرگ آ دبی خاک میں یہیں آہ دھر کے چلے گئے

•

ایسے اشعار کی تعداد کلام میں خاصی ہے۔ اور یہ سب خاص طور پر اپنے زمانہ اور ماحول کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس زمانہ کی نسبت مصحفی کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کہ

یہ زمانہ وہ ہے جس میں ہیں بزرگ و خورد جتنے
انہیں فرض ہو گیا ہے گلۂ حیات کرنا

یہاں ہمیں شاعری میں فنِ ذاتی اور حیاتی، فلسفہ سے تفصیلی بحث کرنے کی ضرورت نہیں البتہ اس قدر وضاحت کرنا ضروری ہے۔ کہ جو ناقدین ہمارے متقدمین شعرا کے کلام میں یاس و حرماں کا اثر زیادہ پاتے ہیں وہ اسے "حیات آفریں" یا "حیات پرور" نہ ہونے کی بنا پر اعلیٰ درجہ کی شاعری تسلیم نہیں کرتے، ہم یہ مانتے ہیں۔ کہ شاعر کا کام صرف "تفسیر حیات" ہی نہیں "تطہیر حیات" بھی ہے۔ لیکن تطہیر کا تصور اور معیار اضافی ہیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ شعر و ادب کی تاریخ ملکوں اور قوموں کی سیاسی تاریخ سے بہت قریب کا تعلق رکھتی ہے۔

چنانچہ شعرا اور ادیب شعوری یا غیر شعوری طور پر انہیں حالات اور واقعات

کو بیان کرتے ہیں۔ جن سے اُن کو جماعتی یا انفرادی حیثیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ قومیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ تعمیری دور میں "تقدیر امم"۔ "شمشیر و سناں" ہوتی ہیں۔ قومی زندگی کے تمام شعبوں میں جدوجہد اور توانائی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ قدرتی طور پر اس دور کی شاعری بھی حیات پرور" اور "جرأت آموز ہوتی ہے۔ اس کے بعد قومیں اپنے عروج کے دور میں داخل ہوتی ہیں۔ مخالفین کا قلع قمع ہو چکا ہوتا ہے۔ عسکری اور فوجی جدوجہد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ طبیعتیں آرام اور سکون کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ فارغ البالی اور اطمینان کی فضا اُن علوم اور فنون لطیفہ کی ترقی کے لیے راستے کھولتی ہے۔ جن کے لیے پہلے دور میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی مثلاً عاشقانہ شاعری، موسیقی، مصوری، بُت تراشی، صناعی۔ رقاصی اس عہد میں فروغ پاتی ہے۔ اسے آپ چاہیں تو "طاؤس و رباب" کہہ لیجئے اور چاہے تمدنی اور تہذیبی ترقی کا نقطۂ عروج، اس کے بعد رفتار رجعت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ قوم میں مردانہ صفات اور اعلیٰ خصائل کی کمی ہو جاتی ہے۔ ادنیٰ جذبات اُبھر آتے ہیں اور زندگی کو اپنی رَو میں بہائے جاتے ہیں۔ شعر و شاعری، ادب اور موسیقی، سب اس رَو میں خس و خاشاک کی طرح بہ جاتے ہیں۔ اور جس طرح طوفان میں سطح "سمندر پر وہی چیزیں اچھل آتی ہیں۔ جو ہلکی ہوتی ہیں اسی طرح بحرانی دور میں ایسے جذبات اور خیالات شاعری اور ادب کی سطح پر آجاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ اس کثرت سے آتے ہیں۔ کہ ساری سطح ان سے آلودہ ہو جاتی ہے۔ اور نیچے کے صاف

شفاف ستھرے جیات پرور اور حیات آفریں سوتے بڑی مشکل سے نظر آتے ہیں۔ رنگین، جرأت۔ امانت۔ چرکین، صاحبقران۔ فاسق یہ سب اسی تعریف میں آتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ کہ یہ لوگ صرف ذاتی اور انفرادی طور پر کسی ذہنی یا نفسیاتی الجھاؤ میں گرفتار تھے۔ جو فحش نگاری کو مقصود بالذات اور محض لذت لینے کی خاطر اختیار کرتے تھے یا چند بگڑے رئیسوں کے عیاشانہ جذبات کی تسکین کا ایک ذریعہ بہم پہنچاتے تھے۔ یہ لوگ تو ایک بحران ہی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ایک ایسے پھوڑے کی جو اندر ہی اندر پک کر بس پھوٹ پڑنے کو تیار ہو۔ جس سے پیپ اور لہو نکلنا شروع ہو گیا ہو لیکن اسے تو نکلنا ہی تھا ورنہ یہی پھوڑا ایک زہریلا ناسور بن جاتا۔ اگر اس طرح یہ فساد رفع نہ ہوا ہوتا تو ۱۸۵۷ء میں جو سیاسی انقلاب کی پہلی کروٹ نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ادبی زندگی کا جمود اور سکون بھی نہ ٹوٹتا، آزاد، حالی شبلی، اکبر اسی دور کے بعد آتے ہیں جس کی ایک کڑی اقبال ہیں اور جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

بعض لوگ چاہتے ہیں کہ شعر و ادب کا یہ چکر الٹا چلا ہوتا۔ اکبر اور اقبال اس دور میں کیوں نہیں پیدا ہوئے۔ جس میں سودا، میر، مصحفی۔ انشا۔ جرأت اور میر حسن ملتے ہیں۔ اور آج کوئی دوسرا میر یا غالب کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے شاعروں کی لے قنوطی کیوں ہے۔ اور آج اچھا بھلا مانس محض اقبال کی تقلید کی خاطر رونے کا مقام ہو۔ تو بھی دانت نکال کر کھلکھلانا چاہتا ہے۔ ایسی غیر فطری توقعات رکھنے والا شخص چاہیے

کچھ ہو۔ شعر وادب کا ناقد نہیں ہو سکتا۔

اب مصحفی کی غزلوں کے ایک اور عنصر کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ یہ تصوّف ہے تصوّف کا سرچشمہ چاہے کہیں ہو اور تصوف کا اصلی رنگ و روپ چاہے کیسا ہو ہماری مراد اس تصوف سے ہے جو ایک عارفانہ مسلک کے طور پر ہندوستان کے مسلمان صوفیوں نے اختیار کیا تھا۔ اس کا بنیادی عقیدہ ہمہ اوست یا ہمہ از وست ہے۔ ظاہر ہے اس تصوّر کے بعد دُنیا اور اس کے تمام مناظر و مظاہر کی حیثیت صرف عکس جمال، ایک خیال، وہم یا دھوکے سے زیادہ نہیں رہتی نہ انسان کی ہستی کا اعتبار رہے اور نہ خود زندگی پائیدار ہے۔ ایسے ماحول میں جہاں سیاسی سکون مفقود ہو اور لوگوں کو طرح طرح کی معاشی اور ذہنی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑے۔ یہ فلسفہ جس قدر تسکین بخش ہو سکتا ہے وہ معلوم ہے اس لئے میرؔ اور دردؔ کو چھوڑ کر بھی جو صوفی تھے ہی عام شعرا کے کلام بالخصوص غزلوں میں یہ رنگ عام ہے۔ مصحفی کے یہاں اس کا نمونہ یہ ہے:۔

مخلوق ہوں یا خالق مخلوق نما ہوں   معلوم نہیں مجھ کو کہ میں کون ہوں کیا ہوں
ہوں شاہد تنزیہہ کے رخسار کا پردہ   یا خود ہی میں شاہد ہوں کہ پردہ میں چھپا ہوں
ہے مجھ سے گریباں گل صبح معطر   میں عطر نسیم چمن باد صبا ہوں
گوش شنوا ہو تو مرے رمز کو سمجھے   حق یہ ہے کہ میں ساز حقیقت کی نوا ہوں
ہستی کو مری ہستی عالم نہ سمجھنا   ہوں ہست تو پر ہستی عالم سے جدا ہوں
یہ کیا ہے کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا   ہر چند کہ خود عقدہ و خود عقدہ کشا ہوں
اے مصحفی شاہیں ہیں مری جلوہ گری میں   ہر رنگ میں میں مظہر آثار خدا ہوں

پردہ گر درمیاں سے اُٹھ جائے ۔ ایک ہاں جسم و جاں سے اُٹھ جائے
کیا تجھ سے کہوں حالِ شہودِ عالم ، کچھ ایک سی ہے بود و نبودِ عالم
بس تو ہی جو پھرے تو ہو نادال ۔ جو عینِ وجودِ حق وجودِ عالم
عینیّت ذات جس کو حاصل ہووے ۔ عینِ دریا ہے گو کہ ساحل ہووے
کیا دخل ہے عکس رونما ہووے اگر ۔ اللہ کے آئینہ مقابل ہووے

یہ تمام عناصر غزلگوئی میں شامل ہیں لیکن جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا۔ غزل کا اصل موضوع پھر بھی عشق و عاشقی کے حزن و حکایت ہیں۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ مصحفی نے اس پہلو کے اظہار کے لیے کیا اسلوب اختیار کیا ہے۔ مصحفی دُنیادار آدمی تھے۔ طبیعت میں درویشی بھی تھی اور کلام میں صوفیانہ مضامین بھی ہیں لیکن اُنہوں نے زندگی کی تلخیوں کو ازدواجی مسرت سے کچھ کم یا ہلکا کرنیکی کوشش کی۔ اس میں وہ ناکام رہے۔ متعدد عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کیے۔ اس کا ذکر تو انہوں نے خود مجمع الفوائد میں کیا ہے۔ ممکن ہے تاک جھانک کی بھی عادت رہی ہو۔ غرض عشق و عاشقی اُن کے لیے ایک مفروضہ مسلک نہ تھا۔ اس وادی میں اُنہوں نے خاک چھانی تھی یہ اور بات ہے۔ کہ انہیں زیادہ تر ناکامی اور محرومی کا مُنہ دیکھنا پڑا تھا۔ مصحفی ایک فراق زدہ عاشق ہیں۔ اُن کا محبوب اُن پر ظلم و ستم کرتا ہے۔ وہ جفائیں سہتے ہیں، لیکن ترک عاشقی پر آمادہ نہیں ہوتے۔ وہ کسی کو اپنے غم میں شریک نہیں کرتے۔ اُن کا کوئی غمخوار نہیں، نہ کوئی محرم راز ہے۔ اس لیے محبت کی جو آگ سینے میں بھڑکتی ہے۔ وہ دبی دبی اُنکے جسم اور جان کو گُھلاتی رہتی ہے وہ مُنہ سے خاموش رہتے ہیں اور دیکھنے والے اُن کے چہرہ

سے اس آتش نہاں سے واقف ہوتے ہیں، لیکن کوئی چارہ گری یا چارہ سازی نہیں کرسکتا اور اُن کی یہ کشمکش اسی طرح جاری رہتی ہے۔ یہی مضامین ہیں، جنہیں مصحفی نے تخیّل کی رنگ آمیزی، جوش و خروش اور نزاکت سے بیان کیا ہے

سو سو طرح کا حادثہ مجھ پر گذر چکا   پیارے دل ایک روز کہیں تو نہ مر چکا
دل میں کہتے تھے ملے یار تو کچھ اس سے کہیں   مل گیا وہ تو نہ ایک حرف زباں سے نکلا
سوچے تھا اہل جرم سے کس کو کروں میں قتل   اتنے میں اُس کو یاد میرا نام آ گیا
گو میں تڑپ کے دی حسرت میں اپنی جان   بارے ٹک ایک دل کو تو آرام آ گیا
سمجھو خدا کے واسطے پیارے بُرا نہیں   دو دن اگر کسی کے کوئی کام آ گیا
میں کہتا تھا عاشق نہ ہو مصحفی   تو ایسی ہی باتوں میں تو گھل گیا
چھیڑے ہے اُسکو غیر تو کہتا ہے اس سے یوں   کوئی کھڑا ہو بس دیوار دیکھتا
مانند گرد باد ہے کچھ رو بہ آسماں   آوارگان شوق کا محمل کدھر چلا
دل و دماغ تھا کب ہم کو ایسی ذلّت کا   خدا کرے کہ بُرا ہووے اس محبّت کا
جفائے یار سے گذری سو دل ہی پر گذری   زباں پہ حرف نہ آیا کبھو شکایت کا
مرا زخم جگر کاری ہے اس مرہم سے کیا ہوگا   موا اب میں تو رو رو مت کرو ماتم سے کیا ہوگا
اس اشک و آہ سے گر دل نہیں لگتا تو گلشن میں   نسیم بوئے گل اور قطرہ شبنم سے کیا ہوگا
رہا ہے کون عالم میں سدا عالم یہ فانی ہے   گر اُٹھ جاوینگے ہم بھی ایکدن عالم سے کیا ہوگا
یہی نہ روتے روتے جی ہمارا ڈوب جاویگا   اگر یوں گر نہ بولوگے میاں تم ہم سے کیا ہوگا
ہمیں آگے ہی اپنا حوصلہ معلوم ہے سچ ہے   بغیر از نالہ و فریاد و زاری ہم سے کیا ہوگا
ڈبویا خانماں مردم کو ان آنکھوں کے بہنے سے   خدا جانے اب آگے دیدۂ پرنم سے کیا ہوگا

دلِ مرحوم پر اب صبر کرنا ہی مناسب ہے   نہ ڈاڑھیں مار رو اے مصحفیؔ اس غم سے کیا ہوگا

•

وصل میں جیوں جیوں مزا پاتا ہے جی   ساتھ باتوں کے چلا جاتا ہے جی
کون مجھ سے رُک رہا ہے ان دنوں   بیٹھے بیٹھے کیوں رکا جاتا ہے جی
جی اگر جاوے کسی کا بے گناہ   آپ کا سچ ہے کہ کیا جاتا ہے جی
ہجر کے غم کو کہاں تک جھیلئے   آہ اپنا تو کھپا جاتا ہے جی
ذکر اس کی چال کا جب آئے ہے   سننے والوں کو رندھا جاتا ہے جی

•

بچا گر ناز سے کوئی تو پھر انداز سے مارا
کوئی انداز سے مارا تو کوئی ناز سے مارا
کسی کو گرمیٔ تقریر سے اپنی لگا رکھا
کسی کو مُنہ چھپا کر نرمیٔ آواز سے مارا
ہمارا مُرغِ دل چھوڑا نہ آخر اس شکاری نے
گہے شاہیں پھینکے اُس پہ گاہے باز سے مارا
غزل پڑھتے ہی میری یہ مغنی کی ہوئی حالت
کہ اُس نے ساز مارا سر سے اور سر ساز سے مارا
نکالی رسمِ تیغ و طشت دلّی میں جزاک اللہ
کہ مارا تو ہمیں تو نے پر اک اعزاز سے مارا
نہ اُڑتا مُرغِ دل تو چنگلِ شاہیں میں کیوں پھنستا

گیا یہ خستہ اپنی خوبی پرواز سے مارا

عشق کے صدمے اُٹھائے تھے بہت سے کیا کہیں ۔ اب تو ان صدموں سے کچھ جی اپنا گھبرانے لگا
دیکھتے ہی اُسکے کچھ اُسکی یہ حالت ہو گئی ۔ جو مجھے سمجھانے آیا تھا میں اسکو سمجھانے لگا

ہے یہ عشق آفت و بلا تو نہیں ۔ اس کا مارا کوئی جیا تو نہیں
دل کی تڑپوں میں آن نکلے ہے ۔ دیکھیو کشتہ ادا تو نہیں
پوچھنا کیا ہے حال دل کا میرے ۔ او میاں تجھ سے کچھ چھپا تو نہیں
یعنی عاشق ہو اور ہر جائی ۔ اب تلک ہم نے یہ سنا تو نہیں
بات پر اُس کی ہیں جو کل بولا ۔ کہا کچھ ذکر آپ کا تو نہیں

ہے ماہ کہ آفتاب کیا ہے ۔ دیکھو تو تہ نقاب کیا ہے
میں نے تجھے تو نے مجھ کو دیکھا ۔ اب مجھ سے تجھے حجاب کیا ہے
آئے ہو تو کوئی دم تو بیٹھو ۔ اے قبلہ یہ اضطراب کیا ہے
مجھ کو بھی گنے وہ عاشقوں میں ۔ اس بات کا سو حساب کیا ہے
اس میکدہ جہاں میں یارو ۔ مجھ سا بھی کوئی خراب کیا ہے

سر شام اُس نے منہ سے جو رُخِ نقاب اُٹھا ۔ نہ غروب ہونے پایا وہیں آفتاب اُٹھا
جو پھر اسکے اس منہ کو تو یقیناً نقاب اُٹھا ۔ اِدھر آسماں اُٹھا اِدھر آفتاب اُٹھا
یہ دم اس کے وقت رخصت بعد اضطراب اُٹھا ۔ کہ لبوں پہ دل تڑپ کے وہیں جاں بتاب اُٹھا
ہیں عجیب یہ رسم دیکھی کہ یہ روز عید قرباں ۔ وہی ذبح بھی کرے ہے اور وہی لے ثواب اُٹھا
نہیں جائے شکوہ اس میں ہے یہی مقتضی زمانہ ۔ یہ زمانہ کا رہا ہے یونہی انقلاب اُٹھا
حسرت یہ اس مسافر بیکس کی روئیے ۔ جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

افسوس کی جگہ ہے کہ دریائے عشق میں   کیا کیا غریب ڈوبے ہیں ساحل کے سامنے
جی سے مجھے چاہ ہے کسی کی   کیا جانے کوئی کسی کے جی کی
شاہد رہیو تو اے شب ہجر   جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی
رونے پہ مرے جو تم ہنسو ہو   یہ کون سی بات ہے ہنسی کی
گو اب وہ بجا ل نہیں یہ ہم سے   لت جاتی ہے کوئی عاشقی کی

مصحفی کی غزلگوئی کے ان نمونوں سے یہ نتیجہ نہ نکالئے کہ تمام کلام انہیں منتخب عناصر کا مجموعہ ہے اور اس میں کہیں جذبات کی پستی یا بیان کی خامی کا دخل نہیں۔ ایسا منتخب کلام تو شاید متقدمین اُردو میں خواجہ میر درد کے علاوہ اور کسی کا نہ نکلے گا۔ میر کی اُستادی کا ہر شخص معترف ہے "لیکن بلندش بسیار بلند و پستش نہایت پست" کی تنقید بھی انہیں کے کلام پر کی گئی ہے۔ شاعری کا ملکہ ودیعت فطری ہی سہی لیکن شعر کو موزوں اور مناسب جذبے اور بیان کے توازن سے پیش کرنے کے لئے شاعر کو بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ آج جن شعرا کا کلام ہمیں نہایت صاف اور سادہ اور دلنشیں نظر آتا ہے اگر ہم اُن کی ابتدائی صورتوں پر نظر ڈالیں تو یہ فرق واضح ہو سکتا ہے۔ اُردو شعرا میں مرزا غالب کے اکثر اشعار ہمارے سامنے ہیں جنہیں مرزا نے اپنی مشق کے ابتدائی دور میں موزوں کیا۔ جو خیال اور بیان دونوں کے اعتبار سے ناقص ہیں۔ مرزا نے خود ہی بعد میں ان کی اصلاح کی۔ ایسے اصلاحوں کے باوجود شاعر کے سرمایہ کلام میں بلند اور پست دونوں قسم کے اشعار باقی رہ جاتے ہیں۔ اول تو جس طرح ایک انسان کے لئے گوری کالی یا

اچھی بُری اولاد میں سے کسی کا اختیار کرنا اور کسی کو چھوڑ دینا ممکن نہیں ہوتا اسی طرح شاعر خود اپنے پست کلام کو آسانی سے قلمزد نہیں کر سکتا۔ اُس کے لئے تو ہر شعر اس کے جگر کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ جیسے وہ سینہ سے لگائے رہتا ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور دقت یہ پیش آتی ہے کہ کم شعرا کو اسطرح اپنے کلام پر نظر ثانی کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اُردو شاعری کی تمام تاریخ میں ایک تو شاہ حاتم ایسے نظر آتے ہیں جو اپنے دیوان کا خود انتخاب کرتے ہیں اور دیوان زادہ کے نام سے اشتہار دیتے ہیں۔ دوسرے مرزا غالب ہیں۔ جنہوں نے خود اپنے اُردو اور فارسی کلام کا انتخاب کیا۔ ان کے علاوہ اگر کسی اور نے انتخاب کیا بھی ہو تو اس کی شہادت نہیں ملتی۔ اسی لئے ہمارے مشاہیر شعرا کے کلام میں بھی اس طرح ایک ناہمواری راہ پا گئی ہے۔ پھر مصحفی کا آخری زمانہ ایسی کشمکش میں گزرا کہ کلام کا انتخاب تو درکنار اس کی باقاعدہ ترتیب کا بھی موقع نہیں ملا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کلیات کے نسخے نایاب ہیں۔ اور صحیح مقدار کلام کے بارہ میں کوئی فیصلہ ناطق نہیں کیا جا سکتا۔

غزلوں کے اشعار میں پستی کئی طرح سے آسکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مضمون ہی پوچ یا فحش ہو یا محض قافیہ عجیب و غریب باندھنے کے شوق میں کوئی بیہودہ مضمون باندھا گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر کو مناسب الفاظ نہ ملے ہوں اور عجیب و غریب الفاظ کے استعمال نے استہزا کا پہلو پیدا کر دیا ہو صنعت گری اور رعایت لفظی کا شوق بھی مضمون اور بیان کو پست کر دیتا ہے یہ تمام باتیں متاخرین شعرائے لکھنؤ کے یہاں جمع ہو گئی ہیں لیکن انکے نمونے مصحفی کے

یہاں بھی موجود ہیں:۔

نظر آتا ہے یہ لونڈا مجھے ہرجائی سا
دیکھ اسے ہر کوئی ہو جاتا ہے سودائی سا (ابتذال)

●

دیکھا ہے اس کا سبزۂ خط خواب میں مگر
منہ ڈالتے نہیں ہیں جو آہو گیاہ پر (رعایت)
ازبسکہ ہو گئے ہیں ترے شوخ طفلِ اشک
باہر نکل کے گھر سے یہ کھیلے ہیں گوئیاں ״

●

مجھ سے وہ ماہِ حنائی نہ ملا
گئے اب کے بھی یوں ہی بارہ وفات (ابتذال)
جو دم حقے کا دوں بولے کہ میں حقہ نہیں پیتا
بھروں جلدی سے گر سلفا کبھی سلفا نہیں پیتا ״
عشق کبوتراں میں جو دل اس کا پھنس گیا
جو آشنا تھا اپنا بیگانہ اُڑا دیا ״
داغ چیچک وہ تیرا کونسا نظروں نہ چڑھا
کہ ہیں عزت سے اُسے آنکھ کا تارا نہ کیا ״
پانی بھرے ہے یاد یہاں قرمزی دوشالا
لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا ״

لیکن ان اشعار سے ہمیں مصحفی کے مسلک یا انکی شاعری کے بارہ میں کسی غلط فہمی میں نہیں مبتلا ہونا چاہیئے، ایسے اشعار کی تعداد اُنکی کلیات میں نہ ہونے کے برابر ہے اور جہاں ہیں، ہاں انہیں اس زمانہ کے عام مذاق اور رجحانات کے پیشِ نظر زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی انکے مقابلہ میں کلام کی کثیر مقدار سے مصحفی کی متین و متوازن طبیعت کا ہی پتہ چلتا ہے

مصحفی کی مثنویوں میں حسب ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں:۔

(۱) مثنوی بحر المحبت جواب دریائے عشق میر تقی میر (۲) مثنوی شعلۂ شوق جواب شعلۂ عشق میر تقی میر (۳) در ہجو چارپائی خود (۴) مثنوی در ہجو مکان خود (۵) مثنوی در ہجو افراط کھٹمل (۶) در تعریف اجوائن خراسانی (۷) در صفت طفل حجام خوش انجام (۸) مثنوی گرما (۹) مثنوی در افراط آتش (۱۰) مثنوی در افراط سرما۔

ان میں تین مثنویاں جن میں اپنے مکان کا نقشہ کھینچا ہے اور چارپائی کی ہجو اور کھٹملوں کی افراط بیان کی ہے۔ ذاتی واردات کے تحت میں آتی ہیں اور اوپر نقل ہو چکی ہیں، دو باتوں کا اندازہ اسی سے ہو جاتا ہے اوّل مصحفی کی قوتِ مشاہدہ اور دوسرے قوتِ بیان، یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ جس طرح اپنی دونوں عشقیہ مثنویوں میں مصحفی نے میر کے نقوش کو دوبارہ اُجاگر کیا ہے۔ اسی طرح غالباً مکان کی تعریف میں اُنھوں نے اس نقشہ سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ جو میر نے اپنے گھر کی خرابی اور برسات کے بیان میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ مبالغہ اس میں بھی ہے لیکن ہمیں مصحفی کی تنگدستی اور مفلوک الحالی کا جو حال معلوم ہے اُس کے پیشِ نظر یہ بیان

دلچسپ بھی ہے اور اثر انگیز بھی۔ فنی اعتبار سے چاہے یہ مثنویاں بہت بلند پایہ تسلیم نہ کی جائیں لیکن مصحفی کی زندگی اور اُن کے کلام کی تنقید میں ان کی اہمیت یقیناً مسلم ہے۔

عشقیہ مثنویوں میں بحر المحبت سب سے طویل ہے۔ اور اسے مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے میر کے فیض کا ذکر مصحفی خود کرتے ہیں ؎

گرچہ ہے کلکِ میر نادرہ کار   تو بھی ندرت کو اپنی کر اظہار
جن مقاموں میں رنگ کم ہے بھرا   دے ذرا اور بھی تو رنگ ملا

اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نہ صرف پلاٹ و طرزِ بیان اور وزن ایک ہے بلکہ زبان اور بعض مقامات پر تو وہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جہاں اختلاف ہے بھی وہاں بہت کم اور اس کا اثر نفسِ قصہ پر بالکل نہیں پڑتا۔ پہلے ایسے مقامات کا ہی جائزہ لینا چاہیئے۔ اس میں پہلے موقع وہاں آتا ہے کہ عشق کا راز ظاہر ہو گیا۔ اور اس کو چھپانے کی تمام کوششیں بیکار گئیں تو لڑکی والوں نے سوچا کہ لڑکی کو دریا پار ایک عزیز کے یہاں بھیج دیں۔ چنانچہ ایک جہاندیدہ دایہ کے ساتھ لڑکی کو روانہ کیا جاتا ہے۔ اس موقعہ پر میر تقی لکھتے ہیں:۔

عشق نے بے پردہ جب فسانہ ہوا   مضطرب کدخدائی خانہ ہوا
گھر میں جا بہرِ دفعِ رسوائی   بیٹھ کر مشورت یہ ٹھیرائی
یاں سے یہ غیرتِ ماہ تاباں   جا کے چندے رہے کہیں پنہاں
شب محافہ میں کر کے اس کو سوار   ساتھ کی ایک دایہ غدّار

پار دریا کے جلد رخصت کی　　اس طرح فکر دفع تہمت کی
گھر تھا اک آشنا کا مدِ نگاہ　　واں ہو رو پوش تا بہ غیرت ماہ

میر صاحب کے بیان کے مطابق لڑکی والوں نے لڑکی کو خاموشی سے رخصت کر دیا۔ مصحفی نے جہاں یہ مرحلہ بیان کیا ہے وہ خاندان والوں کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ ؎

وارث اس نازنیں کے دیکھ یہ حال　　لائے سو سو طرح سے دل میں خیال
جب نہ بن آئی اور کچھ تدبیر　　یہی سوچے کہ اب بلا تاخیر
یاں سے لے جا کے اس صنم کے تئیں　　چندے پوشیدہ رکھیں اور کہیں
پار دریا کے اک ٹھکانا تھا　　ان کا کوئی وہاں یگانہ تھا
ان سے اور اُن سے تھی شناسائی　　دوستی، یک دلی و یک جائی
اعتماد یگانگت بھی تھا　　اتحاد و موانست بھی تھا
شاہد مہر جب ہوا رو پوش　　اور شب آئی ہو گلیم بدوش
ایک محافہ میں کر سوار اسے　　ساتھ دایہ کے بھیجا پار اسے
کہہ دیا یوں کہ یہاں یہ رشک بہار　　ان دنوں رات دن رہے تھی زار
خود بخود اس کے دل پہ غم تھا کچھ　　بے جہت متصل الم تھا کچھ
دن کو بستر پہ زار رہتی تھی　　شب کو اختر شمار رہتی تھی
خواب اور خور میں آگیا تھا قصور　　اُس کو تبدیل مکان تھا ضرور
اس لئے ہم نے اسکو واں بھیجا　　کہ بیاباں کی راس آئے ہوا

میر اور مصحفی کی مثنویوں میں ایک اور نمایاں فرق اس موقع پہ ہے

جہاں دایہ محبوبہ کی جوتی دریا میں پھینک دیتی ہے۔ اور عاشق کو اس کے لانے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس موقع پر میر صاحب نے دایہ کی زبان سے پوری ایک تقریر ادا کردی ہے اور باتوں کو تفصیل سے لکھا ہے۔ دایہ طرح طرح سے عاشقی کا واسطہ دیتی ہے۔ اور غیرت دلاتی ہے۔ مصحفی اس موقعہ پر صرف تین لفظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن پورا مقصد بڑی خوبی سے ادا ہو جاتا ہے ع

ہاں میاں ذرا لینا

اگرچہ عام عاشقانہ مثنویوں کی طرح اس میں جذبات نگاری اور حالت فراق کا نقشہ کھینچنے کا بڑا موقع حاصل تھا۔ لیکن مصحفی نے یہاں اپنے تغزل کے عام رنگ سے ہٹ کر صنعت گری اور رعایت لفظی پر زور صرف کردیا ہے مثلاً ؎

پاس ناموس کا اُٹھا کھٹکا   سر کو اس آستاں سے دے پٹکا
شیشۂ دل کو چُور چُور کیا   پیرہن چاک کرکے دُور کیا
طپش دل نے بات ہی کھودی   بیقراری نے گھات ہی کھودی
جان ہونٹوں پہ آئی آہ کے ساتھ   لہو آنے لگا نگاہ کے ساتھ
سوزش دل دوچند ہونے لگی   سر سے آتش بلند ہونے لگی
صبر بھاگا بدیدۂ گریاں   ناشکیبی سے بندھ گیا پیماں
آہ حیرت کا گھر بنا دل زار   گرم پہلو کیا یہ بستر نار

یہ انداز کچھ اسی قسم کا ہے۔ جو بعد میں دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم میں اختیار کیا ہے۔

اب دوسری عشقیہ مثنوی شعلہ شوق کو لیجیے۔ یہ بھی میر کی مثنوی شعلہ عشق کے جواب میں ہے۔ چنانچہ عنوان میں لکھتے ہیں "مثنوی در عشق یک جوان و تنبولی پسر مسمی بہ شعلہ شوق در جواب مثنوی میر شعلہ عشق" مثنوی مختصر ہے اور اس کا انداز بیانیہ ہے۔ ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ جو ایک خونچکاں حکایت ہے   اسکے راوی سے یوں روایت ہے
کہ کسی نگر میں بطرف شمال   ایک تنبولی رہتا تھا خوشحال
شہرہ حسن اُس کا ہر سو تھا   ماہ سیما ہلال ابرو تھا
خوبرو تھا زبس وہ غیرت ماہ   ہر کسو کی پڑے تھی اُس پہ نگاہ
دور و نزدیک اس پہ مرتے تھے   نقد دل مفت نذر کرتے تھے
آکے دوکان پہ وہ پری رخسار   بیٹھتا جب کہ بر سر بازار
حسن یوسف سے یاد دیتا تھا   دلفریبی کی داد دیتا تھا
جو کہ اُس راہ پہ گذرتا تھا   اُس پہ خواہش کی آنکھ کرتا تھا
تھے خریدار اُس کے جیسے ہزار   حسن تھا اُسکی گرمی بازار

اگرچہ یہ اشعار صاف اور سادہ ہیں اور ان سے یہ معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ تنبولی پسر "حسین و جمیل تھا۔ لیکن پڑھنے والے پر اس سے آگے کچھ اور اثر نہیں ہوتا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شاعری کی تمام اصناف میں بالعموم اور مثنوی میں بالخصوص جب کسی حالت یا واقعہ کو زیادہ موثر انداز میں پیش کرنا ہو تو اکثر جزئیات نگاری سے کام لیا جاتا ہے[1]

---

[1] اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس کلیہ کا اطلاق ہر حالت یا ہر واقعہ پر ہوتا ہے کیونکہ
(باقی صفحہ ۵۵ پر)

اور یہاں مصحفی نے اختصار ملحوظ رکھا ہے۔

اتفاقاً شہر میں ایک لشکر کا گزر ہوا۔ اور ایک لشکری دوکان کی طرف گزرا۔ تنبولی پسر پر نظر پڑتے ہی اس کی جو حالت ہوئی۔ اُسے مصحفی نے اس طرح ادا کیا ہے ؂

دیکھ کافر کی ابروئے پرخم — کھا گیا دل پہ زخم تیغ الم
آفت ایک اُسکی جان پر آئی — یہ بلا اُس جوان پر آئی
کھُب گئی دل میں چشم کافر کیش — سینہ پلکوں نے کر دیا سب ریش
ہاتھ سے چھوٹ گئی زمام سمند — خانہ زین پہ رہ گیا پابند
آکے حیرت نے اُس کو تھام لیا — دور کر بیہوشی نے جام دیا

عشق میں مبتلا ہونے کے بعد جوان لشکری نے یہ دستور کر لیا کہ روز اس دوکان پر آتا۔ اور ایک پیسہ پان کی قیمت دے کر پان خرید لیتا۔ رفتہ رفتہ عشق کا راز افشا ہو گیا۔ ؂

اسی صورت سے گزرے جب کئی ماہ — وارث اُس طفل کے ہوئے آگاہ

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۰۴ سے آگے: کبھی کبھی فنکار اس کے برعکس بھی عمل کرتا ہے مثلاً جس طرح ایک مصور فرشتوں کی تصویر کھینچے اور ان میں ایک پُراسرار عظمت قائم رکھنا چاہے تو وہ خدوخال دھندلے ہی بنائیگا۔ اسی طرح بعض میں شاعر کو بھی کسی قدر ابہام سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور وہاں فن کا تقاضہ یہی کہتا ہے اگر اس موقعہ پر جزئیات نگاری سے کام لیں تو اُلٹا اثر ہوگا۔ مثلاً مثنویوں میں اختلاط کا بیان اس انداز کا مقتضی ہوتا ہے۔

کہ یہاں آکے صبح سے یہ جواں　　اس پہ رہتا ہے نت نظارا کُناں
غالباً اس سے لاگ ہے اس کو　　کیجیے اس کی کچھ تگ و دو
باپ بھائی تھے سخت دانشمند　　یہی تدبیر کی اُنھوں نے پسند
کہ کوئی اس جواں سے کچھ نہ کہو　　کرم حق ہے یہ خوش رہو
رب نے ایسا ہمیں دیا بیٹا　　محو صورت ہے یہ جواں جس کا
حسن دلکش کی داد دیتا ہے　　دیکھے ہے کیا ہمارا لینا ہے

باپ بھائی کی دانشمندی کا یہ تو تقاضہ ہو سکتا ہے۔ کہ خاموش رہو۔ لیکن اس کی جو توجیہہ مصحفی کرتے ہیں وہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اگر ایک نوجوان لشکری کا اُن کے عزیز سے اظہارِ عشق، رسوائی یا بدنامی کا سبب نہ تھا۔ یا ایسی باتوں کو اس زمانہ میں لوگ معیوب نہ سمجھتے تھے تو پھر اس کے "تگ و دو" کرنے کی کیا ضرورت پیش آسکتی تھی۔ اور اگر معیوب بات تھی۔ تو ماں باپ کا یہ کہنا کہ "دیکھے ہے کیا ہمارا لینا ہے"۔ یا اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا اور اسے کرم حق سمجھنا عجیب متضاد بات ہے۔ اور پھر یہ لوگ سوسائٹی کے معمولی افراد تھے۔ صرف تنبولی تھے۔ فلسفی یا صوفی نہ تھے کہ دُنیا والوں کے کہنے کی پروا نہ کرتے اور اسے شاہد و شہود و مشہود کے مسئلوں میں حل کر لیتے۔ چنانچہ عرصہ تک یہ قصہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ لشکر کا اُس شہر سے کوچ کرنے کا وقت آپہنچا۔ لشکری بے چارہ تو دوسرے عالم میں تھا فوج سے جُدا ہو کر رہ گیا۔ گھوڑا، زین، نقد و جنس سب کچھ لٹا کر آزاد ہو گیا۔ اس کے بعد جو حالت ہوئی وہ یہ تھی —

عشق نے جو سرہانے جوش کیا   یا رفیقاں وداع ہوش کیا
قیمت پان میں دل لگا بیٹھا   پیرہن چاک کرکے جا بیٹھا
ہو گیا کچھ دنوں میں سودائی   چاہ آخر کھنچی بہ رسوائی
نوک مژگاں سے اشک خوں ٹپکا   فصد کھلوائی تو جنوں ٹپکا
کسی صورت سے حال دل نہ چھپا   راز ناگفتہ ہو گیا رسوا
کچھ دنوں میں رہی نہ وہ حرمت   رفتہ رفتہ بگڑ گئی ہیئت
ناوک حسن نے جو نشانہ کیا   عشق نے عاشق دوانہ کیا
دن بدن رنگ زرد ہونے لگا   خود بخود دل میں درد ہونے لگا
بیخودی دل پہ جو ہوئی طاری   آکے لیٹا بہ فرش بیماری
لٹ گئی رنگ سرخ کی گلزار   ہو گیا زرد لالۂ رخسار
عشق کی لگ گئی نظر اس کو   مرگ نے آکے دی خبر اس کو

یہ خبر سنکر تنبولی پسر پر جو کچھ گزرا اسے مصحفی نے بس ایک شعر میں ختم کر دیا ہے۔ ؎

سنتے ہی یہ خبر وہ رشک قمر   آہ بھر کر گیا جہاں سے گزر

پڑھنے والے کے سامنے یہ واقعہ اس قدر اچانک پیش آتا ہے۔ کہ وہ ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ اس سے پہلے اس کی کوئی ایسی صورت یا حالت نہ بیان کی گئی اور نہ اس کا اشارہ یا کنایہ کیا گیا۔ جو ہم اس خبر کے سننے کے لئے تیار رہیں یہی وجہ ہے کہ قصہ میں یہاں پہنچکر ایک جھٹکا سا لگتا ہے۔ مثنوی گوئی کے فنی لوازمات میں ایک بات یہ بھی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اصلیت اور واقعیت

کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔ اور اس حیثیت سے مصحفی کا یہ بیان عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اس ذمہ داری سے مصحفی کو بری سمجھیں، کیونکہ انہوں نے قصہ میرؔ سے لیا ہے اور وہی اس کے جوابدہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں اس سے مصحفی کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔ میرؔ کی مثنوی شعلۂ عشق نقش اول تھا۔ نقش ثانی تیار کرنے والے نقاش کو نقش اول کی خامیاں دور کرنے کا بڑا موقع ملتا ہے اور مصحفی نے اس موقع سے بالکل فائدہ نہیں اٹھایا

بہرحال عزیز و اقربا کی اس غم میں جو حالت ہوئی۔ اس کا نقشہ مصحفی نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ ؎

ہوئے مصروف تعزیت اب وغم   ہو گیا سب کا دل لہو ز الم
ہو گئے بیقرار سب زن و مرد   روئی ماں کر کے یہ بیان درد
کاے میرے لال تھا تو گھر کا چراغ   تیرے بجھنے سے ہے جگر پہ داغ

اس موقع سے بھی مصحفی نے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ ورنہ یہاں عزیزوں کے دلی جذبات خصوصاً ماں کی کیفیات بیان کرنے سے ایک ڈرامائی اثر پیدا ہو سکتا تھا۔ اس بین و بکا کے بعد لوگ اس کا جنازہ "کریا کرم" کے لئے لے چلے۔ اور عاشق بھی ساتھ گیا۔ ؎

فلک تیرہ دل بہ ستم بنمود   مردہ اس کا سپرد آتش و دود
یہ جواں اک درخت تھا تنہا   ٹہنی پکڑے ہوئے تھا اس کی لکڑا
اس کی جو لاش کو جلاتے تھے   اس کو باطن میں سوخت پاتے تھے
ایک دو ساعت میں عجب وہ لالہ عذار   ہو گیا جل کے خاک کا انبار

سب پھرے قصد سے تماشہ کیا   آدم ایک پیشتر روانہ کیا
لیک ہونے لگے وہ جب راہی   ہوئی تب اُس جواں سے آگاہی
کسی ہمدرد نے کہی یہ بات   جا کر اُس کو بھی لیجیے اپنے سات
کیونکہ اُس کا انیس ہر دم تھا   وہ جو گل تھا تو یہ بھی شبنم تھا
آ کے اک نے جو اس کا پکڑا ہات   کیا کہوں ہائے وہ حمیدہ صفات
گرا جیسے کہ قالب بے جاں   نہ رہی خاک اُس میں تاب و تواں
یوں ہوا خاک کچھ نشاں نہ ملا   خاک میں کیا وہ نوجواں نہ ملا

اس المیہ کو مصحفی ان اشعار پر ختم کرتے ہیں ؎

عشق کے سوز نے کیا یہ اثر   کہ ہوا بن جلے وہ خاکستر
جذبہ عشق ہے وہ خانہ خراب   جس سے کھنچ جائے آسماں کی طناب
عشق کی دیکھی جب میں یہ بیداد   مجھ کو مطلع ایک اپنا آیا یاد
دل لگی آفت و بلا تو نہیں   اس کا مارا کوئی بچا تو نہیں
اُٹھا اس داستاں کو تہ کر   مصحفی طول عشق کو نہ کر
ہے یہ چنگاری اک جو شعلہ نما   شعلۂ شوق نام ہے اس کا

اب مصحفی کی اُن مثنویوں پر نظر کیجیے۔ جو ہندوستان کے موسموں پر ہیں موسموں کی منظر نگاری کے نمونے ہمیں اُردو میں نظم کی تاریخ میں بہت شروع میں ہی ملنے لگتے ہیں۔ چنانچہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی کلیات میں موسموں اور موسمی تیوہاروں پر بڑی دلکش نظمیں موجود ہیں، میاں نظیر نے جاڑے اور برسات کی بہاریں جس کمال اور خوبی سے دکھائی ہیں۔ اس کا جواب ہماری قدیم

یا جدید شاعری میں سوائے انیس کی گرمی کے سماں کے اور کہیں نہیں ملتا۔ یوں میر سودا۔ میر حسن قائم اور دیگر شعراء نے بھی اپنی مثنویوں میں موسمی مناظر پیش کیے ہیں۔ لیکن ان لوگوں پر غزل یا قصیدہ گوئی کا رنگ ایسا گہرا چڑھا ہوا تھا کہ یہ مثنویاں نظیر کی نظموں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، مثلاً مصحفی گرمی کی شدت کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ؎

کیا کہوں سوزشِ ہوائے تموز   ان دنوں ہے ہوا ہی طاقت سوز
سردی عالم سے کر گئی ہے کنار   موسم گل ہے اور شروع بہار
حوت میں آفتاب آیا ہے   مرغ و ماہی کے تئیں جلایا ہے
مارے گرمی کے سائے جلتے ہیں   اس ہوا میں درخت پگھلتے ہیں
آتشِ گل زبسکہ ہے سرکش   اس پہ لالہ ہوا ہے پھر آتش
ہیں صنوبر کے تار شمع کے تار   سروِ آتش فشاں ہے مثلِ چنار
وہ جو دست چنار یا دا ہے   سو وہ آتش کا پنج شاخلہ ہے
دانۂ نار سب ہے چنگاری   آگ کے پھولوں کی ہے گلکاری
بسکہ طبع ہوا ہے آتش تیز   شاخِ گل تک چمن میں ہے گلریز
جا پڑیں ہیں ادھر اُدھر یک بار   پتے پھولوں کے اُڑ کے مثلِ شرار
کوئی طاؤس ہے جو یہاں دلکش   ہے وہ طاؤس بازی آتش
بیخ کی شکل سروِ دلجو ہے   اُس پہ قمری کباب کو کو ہے
خشک و تر سب نہال جلتے ہیں   کفِ افسوس پتے ملتے ہیں
پاؤں سایہ پہ جو رکھے ناگاہ   کاٹ کھاوے وہ مثلِ مارِ سیاہ

ہیں سلیں پتھروں کی گرم تمام　　جن پہ پائے نگہہ کرے نہ قیام
پھول کھائے جو مرغ آتش خوار　　شکل گلگیر اُس کی ہو منقار
شب کو ماہ فلک میں ہے وہ تاب　　جیسے روشن کرے کوئی مہتاب
لگتے ہیں آسماں پہ یوں تارے　　دکدکاتے ہوں جیسے انگارے
پر طائر ہو جل کے کیوں نہ کباب　　بان سا چھوٹتا ہے تیر شہاب
شفق شام کی جو ہے تحریر　　برق ہے آسماں کی دامنگیر
گینڈے تالوں سے تن کو ڈھانپے ہیں　　شیر گرمی کے مارے ہانپے ہیں
کوئی جاتا ہے گر کسی کے گھر　　مثل مستسقی آب پر ہے نظر

ان اشعار میں آورد صاف ظاہر ہے۔ مبالغہ کی شدت، تشبیہوں اور استعاروں کی کثرت اور تخیّل کی پرواز نے اس مثنوی کو "قصیدہ طور" بنا دیا ہے۔ گرمی کی شدت میں شاعرانہ کمال کے اظہار کے نمونے دیکھنا ہوں تو میر انیسؔ کے کلام کی طرف رجوع کیجیے۔

گرمی کی ایسی شدت میں جس کا حال اوپر بیان ہوا، بستیوں اور بنوں میں آگ بھڑک اُٹھنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ چنانچہ اس کیفیت کو مصحفی نے ایک اور مثنوی میں نظم کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے "مثنوی در افراط آتش"

سوز آتش ہے کس قدر اس سال　　جس سے ہے دل پہ مرد و زن کے ملال
بانس سے بانس جو رگڑتا ہے　　آگ کا شعلہ اک بھڑکتا ہے
یوں پتنگے اُڑے ہیں یک باری　　تو کہے ہے ہوا میں پھلواری
جبکہ چھپر کسی کا جلتا ہے　　کف افسوس شعلہ ملتا ہے

کوئی کاندھے پہ رکھ کے مشکیزا　　آب پاشی کو جاتا ہے دوڑا
کوئی اُس پر گھڑا لڑاتا ہے　　کوئی ہاتھوں ہی سے بجھاتا ہے
تھی جو گھر میں کسی کے کوئی تلوار　　سو وہ بجلی کی ہو گئی یکبار
جس جگہ ہے پرانچہ کی دوکاں　　آگ ناگاہ جو لگے ہے وہاں
گھر کو کر دے ہے اُس کے جوں گلزار　　اُسکو آتش دکھائے ہے یہ بہار
آگ نے بسکہ سر اُٹھایا ہے　　ایک عالم کا جی جلایا ہے
ایک کے گھر سے جو نہیں شعلہ اُٹھا　　جا کے گھر دوسرے کے پھول پڑا
گر لیا اُس کے نہیں بجھا تو خیر　　نہیں تو اور ہی ہوئی ٹک تیز
ایک کے گھر جو لگتی ہے آتش　　اور اُٹھتا ہے شعلہ سرکش
دوسرا جو چڑھ کے اپنے چھپر پر　　اُس کو پانی چھڑک کرے ہے تر
جسطرف دیکھو آگ کی ہے پکار　　گھر کے گھر ہو گئے یہاں فی النار
لگی کیا آگ فتنہ ایک جاگا　　شہدا گھر میں سے گٹھڑی لے بھاگا
لوگ آ کر کے جو پڑے سب ٹوٹ　　مچ گئی گھر میں ایک ڈلے کی لوٹ
کوئی کہتی ہے ہائے رے میں موئی　　کوئی پھرتی ہے بلبلاتی ہوئی
کوئی تکتی ہے مونہہ کو شوہر کے　　کوئی ساتھ اُٹھ چلی برادر کے
کوئی ہمسائے میں چھپی جا کر　　گر پڑی ٹھوکر ایک کوئی کھا کر
سر سے برقع کسی نے پھینک دیا　　اُٹھ مقابا کسی نے ہاتھ لیا
رو گئی کوئی ڈر کے بیچ اڑی　　کوئی اُٹھی جو گرم کڑھی پہ پڑی
سُن کے جو نہیں یہ شور ہمسائے　　مل کے آتش بجھانے کو آئے
بعضے رشتے کے جانے والے بھی　　دیکھ کر آگ کی یہ شعلہ وری

اس بہانہ سے وہاں تلک آئے   حسن و آتش نے جلوے دکھلائے
حسن و آتش کی طرف سیر ہوئی   نہ جلا جی کسی کا خیر ہوئی
روئے زیبا پہ مت نظر کر تو   آتش حسن سے حذر کر تو

ایک کہے ہے جلوہ پیرا دیکھ
مصحفی گھر جلا تماشا دیکھ

یہ مثنوی شدت گرما کے بیان سے بہتر ہے۔ اس میں کسی قدر آمد بھی ہے اور واقعہ نگاری بھی۔ آگ لگنے پر جو حالت ہوتی ہے اس کا نقشہ صاف اور سادہ زبان میں کھینچا ہے۔ مثنوی کے آخر میں ایک پُر لطف شاعرانہ بات بھی پیدا کی ہے۔ کہ آگ لگنے کے حادثہ نے ایسے عشاق کو جو کسی کا رُخ آتشیں دیکھنے کے بیقرار رہتے تھے۔ محبوب کے جلوے کا موقع بہم پہنچایا۔

گرمی کی شدت اور آگ کی کثرت کا حال تو یہ تھا، مصحفی نے "افراط سرما" کی بھی کیفیت لکھی ہے۔ اور اسے پڑھ کر مرزا سودا کی سردی کا احوال یاد آتا ہے۔ ؎

اب کے سردی کا جو ہوا ہے وفور   ڈھانپ کر مُنہ کو رہ گئے ہیں تنور
دیگداں گھر میں سب کے ہیں بیکار   یعنی آتش کا سرد ہے بازار
آئی ہے ہو کے زمہریر یہ ہوا   ہے جہنم زمانہ سردی کا
بن رہے ہیں جو یخ ظروف تمام   برف خانہ ہے خانہ حمام
عوض آتش کے ان دنوں اے یار   خاک کھاتا ہے مرغ آتش خوار

شمع تک جلکے کیا کرے گلگیر   شمع تو بن رہی ہے خود کشمیر
بیچ پانی کے جاڑے کے مارے   بچہ لیط ہیں یخ نیچے سارے
دلمیں سردی سے ہوئے ہے اب درد   آتش عشق ہو گئی ہے سرد
آہ و نالہ ہیں وہ کہاں گرمی   دہر سے ہو گئی یہاں (؟) گرمی
اندنوں وے جو عشق کرتے ہیں   دم بدم آہ سرد بھرتے ہیں
برفباری ہے اب سحاب کا کام   نہیں اس رُت میں آفتاب کا کام
ابر ہو دگلہ پوش آتے ہیں   دانت بجلی کے کڑکڑاتے ہیں
مشک پاتا ہے قیمت کافور   سر پہ نافہ کے ہے کلاہ سمور
جب غریبوں کے سر پہ آئے ہے رات   ہے ہم آغوشی ان کو زانو سات
سر پہ لے کر گلیم بخت سیاہ   گر رہے ہیں گدا جو کرکے آہ
ہے مزاج زمانہ جوں کافور۔   ہووے گرمی کسی میں کیا مذکور
تھی جنہوں کے مزاج میں سردی   اور ہی آگئی ہے نامردی
دست و پا اپنے مخ جو پاتے ہیں   آگ پہ کچھ گرے ہی جاتے ہیں
تپ کی نہ حرف و نہ حکایت ہے   ہے تو سردی ہی کی شکایت ہے
غیرت دیں نہیں رہی زنہار   صاف آتش پرست ہیں دیندار
ہے دوشالوں کی یہ خریداری   نہیں آتی خرید کی باری
پشم پوشی پر بسکہ مرتے ہیں   بعضے کمبل خرید کرتے ہیں
ہے گراں بسکہ شال کا رومال   اوس کو لگتی نہیں ہے قیمت شال
جن کے تن پہ نہیں ہے اک لتا۔   کیا کہوں ہائے حال میں ان کا

آتش افسردی سے ہے شب سرما کا　　قرص خورشید پہ ہے دن کو مدار
ہاتھ میں لیجئے گر انگارا　　ہووے محسوس جیسے یخ پارا
دیکھیو شدت شب سرما　　بن بجھائے چراغ ہے ٹھنڈا
مصحفی اس ہوا میں کیا امکان　　ہووے گرم سخن کسی کی زبان
آگے اب لکھوں میں سردی کے　　کیونکہ میرا بھی ہاتھ کانپے ہے

متقدمین شعرائے اُردو کے کلام میں "عطار پسر" "زرگر پسر" "تنبولی پسر" "تیلی پسر" "حجام پسر" کا ذکر اکثر ملتا ہے۔ بعض نے تو ان کا اشارہ صرف اپنی غزلوں میں چند اشعار تک محدود رکھا ہے۔ لیکن بعض نے ان کی مدح میں پوری مثنویاں اور قصیدے کہہ ڈالے ہیں۔ اس کے اخلاقی پہلو یا مدح و ذم سے ہمیں اس وقت بحث نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس میدان میں مصحفی کے تخیل نے کیا جولانیاں دکھائی ہیں۔ اُن کی مثنوی "در صفت طفل حجام خوش انجام" ملاحظہ ہو:- ؎

زبس آئینہ رو ہے طفل حجام　　نہیں بن دیکھے اُسکے دل کو آرام
وہ گرچہ عاشقوں کا ہے کنیچہ　　پہ سر سہلائے کے کھاتا ہے بھیجہ
اُسے ہر ایک نے بالا دست پایا　　تب ہی تو اُسکے آگے سر نوایا
نہیں آئینہ ہی با چشم نمناک　　ہے شانہ کا بھی دل اُس ہاتھ سے چاک
جو دیکھے انگلیاں وے گوری گوری　　پئے خورشید پانی کی کٹوری
ہے اُسکے ہاتھ سے ہر ایک مفتوں　　برنگ شیشۂ حجام دل خون
نہرنی رکے جب وہ پاس آوے　　ہلال دیدۂ ناخن سے بتاوے

جحامت اُس سے بنوائے جو شائق   کرے یکبارگی ترک علائق
نہیں محتاج کسبت کا وہ لڑکا   ہے اُسکے ساتھ سب ساماں مہیّا
بشکل استرہ ہیں یہ تیغ ابرو   نہیں کچھ فرق اس میں سر مو
بچشم و دیدہ باریک بیناں   کٹوری چشم ہے اور شانہ مژگاں
حق عاشق میں بہر قطع اعراض   کرے ہے انگلیوں سے کار مقراض
کف دست اس کا تسمہ سنگ دل ہے   نہ کہیے کیونکہ اُس کو تیغ قاتل
مپرس از سرمۂ دنبالہ دارش   کہ ناخن گیر شد ہنگام کاوش
وہ جس کے روبرو ناگاہ آیا   اُسے حیرت نے آئینہ دکھایا
اگر آوے بقصد موئے چینی   کرے بینی تلک باریک بینی
نہ کیجے جامہ ہو اُس کی شال   کہ ہے وہ عاشقوں کی ناک کا بال
ہے اُسکے ہاتھ میں روزی کی مفتاح   خط خوباں کو دیتا ہے وہ اصلاح
نفس اُلٹا وہ بھر کر صبح تا شام   کرے ہے گرم جوشی روز حمام
کرے جب جوشش وہ کرکے مشت مالی   نہ ہو عاشق کا کیونکہ کیسہ خالی
وہ ہے دندان شکن باللہ مشہور   نہیں چوں دیگراں محتاج زنبور
کچھ اُس میں غیر جلادی نہیں ہے   کہ اُس کا کام فصادی نہیں ہے
ملا جب آئینہ کو ایسا نائی   بنائی چار ابرو کی صفائی

سُنے ہے مصحفی اب تو بھی فی الحال
منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال

معلوم نہیں واقعی مصحفی سر منڈا کر فارغ البال ہوئے کہ یا نہیں لیکن

مثنوی سے اُس عہد کے مذاق اور شاعری کے ایک خاص انداز پر ضرور روشنی پڑتی ہے۔

مصحفی کی مثنویوں کے ان نمونوں کو ایک ایسی مثنوی پر ختم کیا جاتا ہے جس میں اُنہوں نے خراسانی اجوائن کی تعریف کی ہے۔ مصحفی کے بقول تو دنیا میں اسے اکسیر حیات سمجھنا چاہیے۔ یوں اس مثنوی میں کوئی خاص خوبی نہیں لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی بعض شکمی امراض میں مبتلا تھے۔ اور پابندی سے اسے استعمال کرتے تھے۔ ۵

کیا کروں وصف تیرے اے اجوائن — تو ہے آرام جان و راحت تن
باؤ گولے کا تو نے سر توڑا — ریح نے تیرے ہاتھوں گھر چھوڑا
اشتہا تجھ سے صاف ہوتی ہے — موت سر کو پکڑ کے روتی ہے
بھوک لگتی ہے تجھ سے صبح و شام — تب تجھے ہے نانخواہ تیرا نام
سوئے ہضمی کو دیوے ہے تو شفا — امتلا تجھ سے ہے اسیر بلا
تجھ سے فوراً ڈکار آتی ہے — گل جاں پر بہار آتی ہے
بلغمی صرفہ جس کو ہوتا ہے — تیرا ایک دانہ اُس کو کھوتا ہے
ہاتھ پاؤں میں جس کے ہو گٹھیا — ہے تیرا تیل اُس کا عقدہ کشا
ہڑ کے پانی نے کی بہت سیری — پر نہ پہنچا وہ گرد کو تیری
تیرے دو دانے گر کوئی کھائے — دو ہیں عمر دوبارہ وہ پائے
تو غریبوں کے کام آتی ہے — رخ صحت انہیں دکھاتی ہے
بسکہ تو ہے عزیز دینداراں — از برائے شفائے بیماراں

دے جو قرآں کرے ہیں اکثر ختم ۔۔۔ رمضاں میں کرے ہیں تجھ پر ختم
بعد ازاں ہاتھوں ہاتھ پیر و جواں ۔۔۔ تجھ کو دے جاتے ہیں تبرک جاں
ہو زباں تیز پانت تا نہ میری ۔۔۔ کسطرح کر سکوں بیاں وصف تری
مصحفیؔ کو جلا دیا تو نے ۔۔۔ سحر کا یہ صلہ دیا تو نے

تیری ہمت پہ آفریں کہیئے
جانِ آدم ترے تئیں کہیئے

اُردو مثنوی کی تاریخ اور مثنوی گوئی کے فنی لوازمات پیشِ نظر رکھ کر مصحفی کی مثنویوں کے بارہ میں یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ کہ اس فن میں وہ زیادہ سے زیادہ "مقلد" کہلائے جا سکتے ہیں۔ اُن کے سامنے غالباً سودا اور یقیناً میر کی مثنویاں تھیں۔ سودا خود اس میدان میں بدنام ہیں وہ مصحفی کی رہبری کیا کر سکتے تھے۔ میر کی عشقیہ مثنویاں بے شک اعلیٰ درجہ کی ہیں لیکن میر اثر کی خواب و خیال، میر حسن کی سحر البیان، شوق کی زہر عشق یا شوق قدوائی کی عالم خیال کے پایہ کی ان میں بھی کوئی مثنوی نہیں، اس لئے مصحفی سے اس سے بہتر مثنوی کی توقع بے سود ہے۔ لے دے کر اگر کچھ جان ہے۔ تو صرف اُن مختصر مثنویوں میں جن میں مصحفی نے خود اپنی زبوں حالی کا رونا رویا ہے۔

لیکن قصیدہ کے میدان میں مصحفی بھی صفِ اول میں ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ان کا نام ملک الشعرا نصرتی، سودا۔ ذوق۔ امیر مینائی۔ محسن اور ان کے ہم پلہ شعرا کے ساتھ لینا چاہیئے۔ ان میں فنی حیثیت سے استادی

کا شرف خاص طور پر نصرتی۔ سودا اور ذوق کے حصہ میں آتا ہے۔ نصرتی اُردو شاعری کے ابتدائی دور یعنی دکھنی عہد میں سب سے ممتاز ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اُردو زبان اپنی ترقی کی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی۔ قصیدوں کے لئے صرف بلند تخیل ہی نہیں نہایت ترقی یافتہ زبان بھی درکار ہوتی ہے اگر الفاظ کی ہماہمی، تراکیب کی بلند آہنگی۔ تشبیہات اور استعارات کا تنوع اور فراوانی شاعر کو میسّر نہ ہوں، تو مدح سرائی شاعرانہ فن سے عاری ہو کر محض بھٹئی رہ جاتی ہے۔ نصرتی کا یہ کمال ہے کہ اُنھوں نے اس ابتدائی دور میں بھی اس ہماہمی اور غلغلہ کو نبھایا ہے۔ اُن کی تشبیبیں خاص طور پر نہایت زوردار ہیں اور مدح کے عام مضامین بھی ایسے جوش سے بیان کئے ہیں۔ کہ ان کی مثال بہت بعد تک اور کہیں نہیں ملتی۔ اُن کے بعد دکن کا کوئی دوسرا شاعر اس رنگ کو ترقی نہ دے سکا۔ شمالی ہند کے شعراء میں دور اوّل میں سراج الدین علی خاں آرزو، مرزا مظہر جانِ جاناں، حاتم کے دور تک لوگوں کی زیادہ تر توجہ غزل گوئی کی طرف رہی یہاں تک کہ سودا نے قصیدہ کی زمین کو آسمان بنا دیا۔ وہ مدح اور قدح دونوں کے بادشاہ تھے مضمون کی تازگی۔ تخیل کی جدت اور پرواز، بیان کی ہمہ گیری، الفاظ کی شان اور بلند آہنگی، تراکیب کا شکوہ۔ تشبیہات اور استعارات کی ندرت، مبالغہ کا زور، غرض قصیدہ گوئی کے جس قدر لوازمات ہیں۔ وہ سب ان کے کلام میں موجود ہیں۔

ہمارے پاس یہ یقین کرنے کے لئے کہ قصیدہ گوئی میں مصحفی نے سودا کا کلام پیشِ نظر رکھا ہے۔ قوی داخلی شہادتیں موجود ہیں۔ سودا کی شاعری کے شباب

کا دور مصحفی سے پہلے کا ہے۔ چنانچہ مصحفی نے جب قصیدہ گوئی شروع کی تو سودا کی استادی اور شہرت مسلم ہو چکی تھی۔ مصحفی بار بار اس پر جھنجھلاتے ہیں۔ اُن کے نفسیاتی پس منظر میں اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اُن کے کئی قصیدے سودا کی زمینوں میں ہیں اور تشبیبوں میں اُنھوں نے وہی انداز اختیار کیا ہے جو سودا کا ہے۔ پھر دونوں کے بعض ممدوح مشترک ہیں۔ نعت اور منقبت میں دونوں نے حضرت علی اور ائمہ کی مدح سرائی کی ہے۔ اُن کے علاوہ نواب غازی الدین حیدر اور نواب آصف الدولہ کی مدح میں دونوں کے قصیدے موجود ہیں البتہ ہجو میں وہ سودا کے انداز کی تقلید نہیں کرتے۔ کچھ تو اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے اور کچھ اس لیے کہ اُن کے نزدیک کوئی ہجو کے لائق ہی نہ تھا۔ انھوں نے اس طرف توجہ نہیں کی ورنہ وہ اُردو قصیدہ کی تاریخ میں یقیناً دوسرے سودا مشہور ہوتے۔ پھر بھی ان کا جو کلام اس صنف میں موجود ہے۔ اس سے اس فن میں ان کے استادانہ کمال کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔

کلیات میں قصائد کے تین دیوان علیحدہ ہیں اور عنوان کی عبارت سے ان کی سند ملتی ہے۔

"در جلد ہائے قصائد زبان مصحفی سلمہ کہ از دستخط خاص نقل گرفتہ شد"[1]

پہلے دیوان میں حسب ذیل قصائد شامل ہیں:۔

(۱) قصیدہ نعتیہ (۲) قصیدہ نعتیہ (۳) قصیدہ در مدح صفدر علی خاں

---

[1] کلیات صفحہ ۳، ۳۰۳

(۴) قصیدہ در مدح مرزا محمد تقی ہوس (۵) ایضاً (۶) ایضاً (۷) در بیان مرثیے (۸) قصیدہ جواب قصیدہ انشاءاللہ خاں در مدح شاداب علی خاں (۹) مدح اسپاں جلال الدولہ بہادر (۱۰) قصیدہ در جواب قصیدہ مرزا رفیع سودا در مدح سعادت علی خاں (۱۱) در مدح کلب علی خاں (۱۲) مدح نواب غازی الدین حیدر (۱۳) مدح کلب علی خاں (۱۴) ایضاً (۱۵) ایضاً (۱۶) مدح نواب معتمد الدولہ بہادر (۱۷) مدح نواب روشن الدولہ (۱۸) ایضاً (۱۹) ایضاً (۲۰) مدح نواب ہادی علی خاں (۲۱) مدح میر فضل علی۔ (۲۲) ایضاً (۲۳) ایضاً (۲۴) مدح نواب معتمد الدولہ بہادر۔

اس دیوان کے خاتمہ پر تحریر ہے[1]

"تمت تمام شد قصیدہ تصنیف میاں مصحفی صاحب بخط خام بندہ اجودھیا پرشاد برائے ملازمان جناب اقدس و اعلیٰ نواب عاشور علی خاں بہادر"

دوسری جلد نعت و منقبت میں ہے۔ اور اس میں حسب ذیل قصائد شامل ہیں:-

(۱) قصیدہ نعتیہ (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) قصیدہ در منقبت حضرت علی مرتضیٰ (۵) ایضاً (۶) ایضاً (۷) ایضاً (۸) ایضاً (۹) ایضاً (۱۰) ایضاً (۱۱) ایضاً (۱۲) در منقبت امام حسن علیہ السلام (۱۳) در منقبت امام حسین السلام (۱۴) در منقبت حضرت امام زین العابدین علیہ اسلام

---

[1] کلیات صفحہ ۴۰۵

(۱۵) قصیدہ در مدح علی اکبر (۱۶) ایضاً۔

تیسری جلد میں سلاطین اور امرا کی مدح میں قصیدے شامل ہیں:۔

(۱) در مدح جہاندار شاہ (۲) در مدح صاحب عالم (۳) در مدح آصف الدولہ بہادر (۴) ایضاً (۵) ایضاً (۶) ایضاً (۷) در مدح یوسف علی خاں (۸) ایضاً (۹) ایضاً (۱۰) ایضاً (۱۱) ایضاً (۱۲) ایضاً (۱۳) در مدح نواب محبت خاں (۱۴) ایضاً (۱۵) ایضاً (۱۶) قصیدہ تیغ بُراں (۱۷) مدح شیدی علی خاں (۱۸) ایضاً (۱۹) در مدح سلیمان شکوہ (۲۰) ایضاً (۲۱) ایضاً (۲۲) ایضاً (۲۳) ایضاً (۲۴) ایضاً (۲۵) ایضاً (۲۶) در مدح اسپ کہ "یار وفادار" نام است (۲۷) نسبت انشاء اللہ خاں (۲۸) قطعہ در خدمت سلیمان شکوہ (۲۹) در مدح صاحب عالم (۳۰) در مدح سلیمان شکوہ (۳۱) در مدح صاحب عالم قصیدہ ناتمام (۳۲) مدح و عرض حال سلیمان شکوہ (۳۳) مدح آصف الدولہ بہادر (۳۴) در مدح خیالی رام (۳۵) ایضاً (۳۶) ایضاً (۳۷) ایضاً (۳۸) قصیدہ (۳۹) مدح مرزا علی حسن خلف نواب سالار جنگ (۴۰) مدح نواب آصف الدولہ بطور جلال گفتہ شد (۴۱) مدح مرزا حسن علی (۴۲) مدح لالہ ٹیکا رام (۴۳) قصیدہ نسبت بہ چند شخص گفتہ شد (۴۴) مدح خیالی رام۔ اس طرح ان قصیدوں کی تعداد ۴۸ تک پہنچتی ہے۔ ان میں بعض مختصر اور بعض خاصے طویل ہیں اور یہ ایسی مقدار ہے۔ جس کے پیش نظر مصحفی کو مستقل قصیدہ گو شعرا کی فہرست میں شامل کرنے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا۔

زمانہ کے بدلتے ہوئے مذاق اور ماحول نے قصیدہ گوئی کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی اور اسی لئے اس کی فنی اور شاعرانہ اہمیّت کا پورا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ بعض لوگوں کی یہ رائے ہے۔ کہ قصیدہ گوئی نے ہمارے بہت سے اچھے شعرا کی شاعرانہ صلاحیتوں کو غلط راستہ پر لگا کر برباد کر دیا۔ یہ ایسے لوگوں کا خیال ہے جنہوں نے قصائد کی فنی اہمیّت کا پوری طرح جائزہ نہیں لیا ہے۔ ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا۔ کہ خالص شاعرانہ نقطۂ نظر سے بھی قصیدوں میں فنی شاہکار موجود ہیں۔ دوسرے ان قصیدوں کو پڑھتے وقت اس وقت کے ماحول اور تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ مشرقی ممالک خصوصاً ایران اور ہندوستان میں جہاں شخصی حکومت کا رواج تھا۔ اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر شرفا اور اہل سیف و قلم کا ایک محدود طبقہ ہی مامور تھا۔ علوم و فنون کی سرپرستی اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی سلاطین، وزرا اور امراء کے حصّہ میں آئی تھی۔ اور اس بارہ میں یہ لوگ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جذبہ رکھتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ جو صاحب کمال ایک دربار سے بددل ہو کر نکلتا دوسری جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ اور اس کی پہلے سے بڑھ کر قدر دانی کی جاتی۔ یہی سبب تھا۔ کہ جب تاتاریوں کے سیلاب نے ایران کی علمی اور ادبی محفلوں کو درہم برہم کر دیا۔ تو ارباب کمال نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ دلّی تو دارالخلافہ تھی۔ اور ایران سے قریب تر لیکن سرپرستوں کی کشش ان لوگوں کو سرزمین دکن اور بنگالہ تک لے گئی۔ اور اس طرح ان لوگوں کی بدولت علم و فن کی

شمعیں ایسے دور دراز گوشوں میں بھی روشن ہو گئیں۔ جہاں اس سے پہلے صرف اندھیرا تھا۔ اگرچہ یہ سلاطین، امراء اور وزراء خود بھی صاحبِ کمال تھے لیکن ان میں سے جو اس سعادت سے محروم بھی ہوتے ارباب فضل و کمال کی سرپرستی میں وہ بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ ایک اکبر کی مثال ہی اس کے لئے کافی ہے۔ ان حالات کو پیش نظر رکھیں۔ تو آزاد مشرب شعرا کا مدح سرائی پر مائل ہونا سمجھ میں آجاتا ہے۔

قصیدہ گوئی کا فن آسان نہیں۔ مدح کے مقررہ مضامین اس قدر عام اور پامال ہیں کہ ان کے دہرانے سے کوئی مزہ حاصل نہیں ہوتا اور ان سے تجاوز کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ قصیدہ کے ایک حصہ میں ممدوح کی ذاتی صفات کا ذکر اُس کی شجاعت، عدالت، اور رعیّت پروری اور سب سے بڑھ کر سخاوت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مداح کو صلہ کی توقع ہوتی ہے۔ اُس کی علم دوستی اور شاعر نوازی کی تعریف کی جاتی ہے۔ اور خود اس کے علم و فضل فہم و دانش، نکتہ آفرینی اور نکتہ سنجی کا اعتراف ہوتا ہے۔ لوازمات امارت میں محلات اور باغات کی تعریف، گھوڑے، تلوار اور ہاتھی کی مدح بھی ضرور شامل ہوتی ہے اور بالعموم ممدوح کی دینداری کا بھی ذکر ہوتا ہے اب ان تمام مضامین کو اگر معمولی طریقہ سے ادا کر دیں تو کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوتی۔ اس لئے مضامین تو یہی ہوتے ہیں۔ لیکن شاعر اپنے کمال کے اظہار کے لئے تخیل کا پُورا زور صرف کر دیتا ہے۔ وہ مبالغہ سے انہیں پرانے مضامین میں جدت پیدا کرتا ہے۔ نئی تشبیہوں اور نادر استعاروں سے

تازگی کی ایک نئی کیفیت پیش کرتا ہے۔ اور اسی سے اس کے کمال کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

اگرچہ قصیدہ کا عام مفہوم مدح سرائی ہی سمجھا جاتا ہے لیکن اس میں مدح کے علاوہ اور عناصر بھی شامل ہیں۔ قصیدہ کا ابتدائی حصہ اصطلاحاً تشبیب کہلاتا ہے۔ تشبیب کے معنی ذکر شباب کے ہیں لیکن عام طور پر اس میں ذکر بہار ہوتا ہے۔ قید کسی خاص مضمون کی نہیں۔ بہار کے علاوہ اور موسموں کا بھی ذکر ہو سکتا ہے۔ شکایت زمانہ بھی ایک عام مضمون ہے۔ اپنے علم و فضل کا اظہار اور اپنے کمالات پر تعلی بھی ہوتی ہے۔ خواب میں آکر ہمکلام ہونے والی کسی پری چہرہ حسینہ کے حسن و جمال کا بیان بھی ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی صرف غزل کے مضامین ہوتے ہیں۔ قصیدہ گو شاعر کے کمال کا اندازہ سب سے پہلے اسی سے کیا جاتا ہے۔ کہ تشبیب کس پایہ کی ہے۔ اس میں مضمون کی تازگی اور ادا کی جدت دونوں کا خاص طور پر جائزہ لیا جاتا ہے۔ آئیے دیکھیں مصحفی نے تشبیب میں کیا انداز اختیار کیا ہے

تشبیب بہاریہ :۔

بسکہ اس فصل میں ہوتے ہیں ہرے عظم رمیم
روکش باد مسیحا ہے گلستاں میں نسیم
نشترِ خار کی جا دہاں سے اُگے ہے سبزہ
بسکہ کرتی ہے ہوا خاک کو بیعت تعلیم
صحن ہے صاف نراز دامنِ دیبائے آتک
لالہ ہے سُرخ نراز کاغذ ہندی تقویم
آب جو یار ہے یوں گرد خیاباں کے محیط
ورقِ لعل پہ جیسے ہو کھنچی جدولِ سیم
دیکھ صحبت کو بہم لالہ و نافرماں کی
شفقِ شام نے بھی شام سے کھائی افیم

شعلہ افروز ہے ہر سو جو گلوں سے گلشن سطح باغ ہے آتشکدۂ ابراہیم
شاہد رنگ جدیدی کا ہوا ہے جلوا تازگی لائے ہیں شاخوں پہ درختاں قدیم

• (قصیدہ در مدح صفدر علی خاں) جلد اوّل

ہے ربیعی کا جو اترا ہوا ہر سو لشکر علم سبز نظر آتی ہے گیہوں کی ہری بال
قوت نامیہ کے فیض سے کچھ دور نہیں برگ و بر لائے بیاباں میں اگر شاخ غزال
کہنگی تھی جو درختوں کی وہ سب دور ہوئی نکلے پھر پتے ہرے اور نیا آیا سال
شاہد گل نے کیا اپنا نگاریں پنجہ فندق غنچہ نظر آنے لگی کیسہ لال
حوض نوارے ہیں معمور چمن ہے سرسبز موج مارے ہے لب جو سے پڑا آب زلال

• (قصیدہ در مدح مرزا محمد تقی) جلد اوّل

برج حمل میں نیر اعظم کا ہے گذار کیونکر نہ ہو بہ وضع دگر رنگ روزگار
جوش و خروش و ولولۂ نامیہ سے ہے گلہائے نودمیدہ کے آئے بروئے کار
پاتا ہوں تازگی سے درختان خشک کو آئین فصل میوہ مہیائے برگ و بار
گلگوں سوار لالہ نعماں کے روبرو ہے گردستہ ہائے قزلباش کی قطار
خود پھوٹ کی طرح سے پکتا ہے اس کا پوست کیونکر کرے نہ خندۂ دنداں نما انار
ششدر ہے اسکو دیکھ کے چرخ زبرجدیں مہندی کی ٹٹیوں نے بنایا ہے جو حصار
پھولوں کی سمت دیکھئے گرداب کی ساں ہے سب سے زیادہ ناختنۂ رنگ پر بہار

• (مدح کلب علی خاں) جلد اوّل

اہل طرب نے ساز طرب کوک کر لئے گلبانگ مطرباں کی گئی آسماں سے پار
پھر تالیاں بجانے لگے برگ ہر درخت باد صبا کو دیکھ کے رقصاں و بیقرار

رنگ زعفرانی دیکھ کے اُسکا یہ بولی خلق
معشوق خوبرو ہے کہ گھوڑے پہ ہے سوار
سکان زیر خاک کے دل کو ہوئی خوشی
پیک صبا نے دی خبر آمد بہار
لالوں نے رنگ رنگ کی مے سے بھرے جو جام
پی کر کے اُن کو ہو گیا سرمست کوکنار
نورستہ سنبلی نے نکالا زمیں سے سر
پھر کچھ پکڑ کے چلنے لگی آب جویبار
چوں شاخہائے سبز کے آئے نظر نشاں
باغ جہاں سے فوج خزاں کر گئی فرار
پہنے ہوتے ہیں بر میں لباس بہشتاں
اوراق سر سے تن عریاں شاخسار
نرگس کے گرد پھولوں کے لالہ سے ہے عیاں
اُس کے لگی ہے ہاتھ قلمکار جامہ وار
سوچا میں دل میں دیکھ کے نسریں کی کیاریاں
مثل فلک ہے سطح زمیں کیوں ستارہ دار
یارب یہ رنگ ہے کہ دو گل کو گئی ہے بھول
بلبل کو دل میں چبھتی تھی یا کہ نوک خار
اس کو بھی چشم لطف سے دیکھے ہے باغباں
پاتا چلا ہے سبزہ بیگانہ اعتبار
جوں آسمان سبز پہ ماہ دو ہفتہ ہو
ایسی صفا سے چمکے ہے سبزہ میں آبشار
کوئی زمیں سادہ نہ دیکھی کہ وہ نہ ہو
سر سبزی بہار سے ہم رنگ مرغزار

(مدح میر فضل علی داروغہ بادشاہ بیگم) جلد اول

روز نوروز کرے کیوں نہ دلوں کی صیقل
عکس خورشید سے ہے روکش آئینہ خجل
گل مہتاب میں ایسی ہی صفا ہے کہ نظر
صحن پر اُسکے قدم رکھتے ہی جاتی ہے پھسل
خاک سے مردہ صد سالہ کے بوسیدہ عظام
سبز ہو کر کے دو دہیں دانہ سے آتے ہیں نکل
پھول جاتی ہے۔ وہ نہیں آنکھوں تلے سرسوں سی
منتشر ہوے ہے گر خاک میں منت خردل
باغ میں جائے جو شب کو تماشے کے لئے
سبز آتا ہے نظر شعلہ و دود مشعل
باغ معمور رہے پھولوں سے کہے تو اس سال
تھا دفینہ جو دیا خاک نے یکبار اُگل

نہ فقط لالے نے کچھ ناز سے کج کی ہے کلاہ   زلفِ سنبل میں بھی پڑ گیا ہے ایک انداز سے بل
اب اُسے دیکھ کے ہے عرش پہ اُس کا بھی دماغ   کیتکی نام جو لونڈی تھی چمن کی شفتل
مُنہ میں شبنم کے بھر آئے ہے ہر دم پانی   بسکہ دل اُس کا گیا ہے رُخِ گل پہ پھسل

• در منقبت حیدر کرار صاحب ذوالفقار، جلد سوم

خاک چمن نے رنگ نکالا ہے اب کی سال   پھولوں کی ڈالیاں نظر آتی ہیں لال لال
سبزے کی مومیائی سے ہو جاوے ہے درست   ٹوٹے ہے گر زمیں پہ کہیں کاسۂ سفال

• (در منقبت حضرت امام حسین، جلد دوم

آتا ہے کیا چمن میں مگر تاجرِ بہار   کھولے ہیں ہر طرف کو جو غنچوں نے اپنے بار
پھسلے ہے دیکھتے ہی خریدار کی نظر   ہے بحر بال آب رواں بسکہ آب دار
جاتا ہے جو کوئی سوئے بزاز گل شوق   اپنی طرف کو کھینچتی ہے بلبل اُسے پکار
نازک قماشی گل رعنا پہ کر نظر   پیدا ہے روئے کار سے خوبی پشت کار
ہے بادلہ پہ جوئے رواں کے نگاہ چرخ   خواہاں ہوا ہے مخمل سبزہ کا روزگار
خورشید کے بھی جی میں یہی ہے کہ کیجئے   زر بفت جعفری پہ زر جعفری نثار
ارزش کا بسکہ گرم ہے بازار ان دنوں   ہے خار کو حریر رگ گل کا اعتبار
مرزا مزاج پھرتے ہیں ازبسکہ ذرّے   ٹک کھوتے ہی بک گئے قالین لالہ زار
کی ہے پسند سرو نے الوان فاختہ   آزادی اسکی اس سے ہی ہوتی ہے آشکار
موقوف قشمہ پہ نہیں یہاں جو دیکھیے   ہر قسم کی متاع و نفایس ہیں بے شمار
دل نے کہا یہ مجھ سے کہ شبنم کے دانوں سے   لے نذر بادشاہ کے لیے موتیوں کا ہار

• (قصیدہ در مدح صاحب عالم، جلد دوم)

یہ مثالیں مصحفی کی بہاریہ تشبیبوں کا رنگ دکھانے کے لیے کافی ہیں ان میں بہار کے واقعی مناظر کا ذکر کم ہے۔ لیکن مبالغے کے باوجود پڑھنے والے کو کچھ نہ کچھ بہار کے وجود کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مبالغہ جو قدم قدم پر قصیدہ کے فن میں شامل ہے۔ یہاں بھی اپنا رنگ لایا ہے لیکن مصحفی کا شاعرانہ کمال یہ ہے۔ کہ مضمون کی تازگی اس عیب کی پردہ پوشی بن گئی ہے۔ اور ندرت ادا نے ان کی شاعرانہ خوبیوں کو اور نمایاں کر دیا ہے۔ اکثر شاعروں کے قصیدوں میں تشبیبیں اس قدر طویل ہوتی ہیں کہ پڑھنے والا اکتا جاتا ہے۔ مصحفی کا کلام اس عیب سے پاک ہے۔ بعض اور شعراء اپنے علم و فضل اور نادر الکلامی کے استعمال کے لیے دقیق اور نامانوس الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ جیسا کہ سودا کے بعض قصیدوں میں ہے اور بعض شعرا نہایت مشکل ردیف اور قوافی اختیار کرتے ہیں جن کی وجہ سے اکثر مضحکہ انگیز مضامین باندھنا پڑتے ہیں۔ یہ تشبیبیں اس سے بھی پاک ہیں۔

تشبیبوں کا دوسرا انداز وہ ہے۔ جن میں مصحفی نے اپنے کمالات کا اظہار کیا ہے۔ یا اپنے حریفوں پر چوٹیں کی ہیں یا پھر شکایت زمانہ اور اپنے ناقدری کا شکوہ کیا ہے۔ ان تشبیبوں کی مثالیں مصحفی کے ذاتی اور نفسیاتی پس منظر کے بیان میں نقل ہو چکی ہیں۔ اس لئے ان کا اعادہ بیکار ہے۔ یہ تشبیبیں اس لئے اور اہم ہو جاتی ہیں۔ کہ ہمیں ممدوح سے قطع نظر خود مصحفی کے ذاتی حالات اور رجحانات کے مطالعہ میں ان سے مدد ملتی ہے۔ ان میں مبالغہ نام کو نہیں

اور شاعرانہ تعلّی کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مصحفی جو کچھ بیان کر رہے ہیں۔ اس کی بنیاد اصلیت اور واقعیت پر ہے۔ اُردو کے قصیدہ گو شعرا میں یہ بات سوداؔ کے علاوہ کسی اور کے یہاں کم ملتی ہے۔ سوداؔ نے البتہ اپنے ذاتی حالات کے علاوہ اپنے زمانہ کے سیاسی خلفشار، معاشرتی بحران اور افراتفری کا بڑا سچا نقشہ کھینچا ہے۔ اور یہی کیفیت مصحفی کی ہے۔ ان تشبیبوں کے پردہ سے سُننے والے کو مصحفی کی درد انگیز اور رقّت خیز لَے صاف سُنائی دیتی ہے۔

تشبیبوں کا تیسرا رنگ تغزّل ہے۔ یہ مصحفی کی ایجاد نہیں۔ عربی اور فارسی میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ اُردو میں سوداؔ اور بعض دوسرے قصیدہ گو شعرا نے بھی اس طرف توجہ کی ہے۔ لیکن مستقل رنگ کی حیثیت سے یہ صرف میر حسن اور مصحفی کا ہی حصّہ ہے۔ میر حسن کے قصیدوں پر تو تغزّل کا رنگ ایسا گہرا ہے۔ کہ اُن سے قصیدوں کی شان جاتی رہی ہے۔ اِسی لئے ناقدین نے ان پر زیادہ توجہ صرف نہیں کی ہے۔ البتہ مثنویوں کی علاوہ ان کی غزل گوئی کے سب معترف ہیں۔ میر حسن کا کلیات ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اور غزلیات کے دیوان کا ایک انتخاب نولکشور پریس سے شائع ہوا ہے کلام کے اکثر و بیشتر حصّے کے غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے ان کی غزل گوئی کے ساتھ بھی کما حقہ انصاف نہیں کیا جا سکا ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کی قصیدہ گوئی کا رنگ بھی عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ مصحفی کی تشبیبوں کا یہ رنگ ذیل کی مثالوں سے واضح ہوتا ہے:۔

بنے خمیازہ جو اُس گل کی گئی چولی چس   جا پڑی صاف بدن پر نگہہ اہل ہوس
خندۂ گل کے ہوئے ایسے نہ مصروف کہ بس   ہمصفیران نے نہ کی یاد اسیرانِ قفس
سانڈ ناقہ کی جو کی گرم روی مجنوں نے   تپشِ ریگ بیاباں سے گئے پاؤں جھلس
کشتی چرخ نہ طوفاں میں آ جائے کہیں   دن ہیں برسات کے اے ابر مژہ تو نہ برس
تا قیامت کبھی بیدار نہ ہو وہ مسموم   افعی زلف بتاں جس کے تئیں جاوے ڈس
بسکہ میں ضبط غم عشق کیا ہجراں میں   پھوڑے کی طرح سے سینہ گیا یک لخت کس

(مدح کلب علی خاں، جلد اوّل)

زبسکہ شوق جنوں ہے میرا گریباں گیر   ہر ایک تار سے آتا ہے نالۂ زنجیر
نہ نکلی اس میں ذرا حسرت دل عاشق   شب وصال تھی اک پل سے بھی زبسکہ قصیر
فلک کو ہے مہ و خورشید پر بڑا اغرا   کہ کی ہے دعوت یک خلق بر دو ناں فقیر
تونگری نہیں کچھ بے بصر کے کام آتی   شعاع مہر سے روشن نہ ہوئے چشم ضریر

(مدح کلب علی خاں جلد اوّل)

جو ہاتھ آتا میرے یکسر گریباں آستیں دامن   سنبھالو چاک کرکے درخور گریباں آستیں دامن
یہ دیوانوں کی مجلس ہے تو اٹھ جا یہاں سے اے ناصح   کہ یہاں جنگل میں ہیں اکثر گریباں آستیں دامن
جنوں تو دیکھ میرا اپنے ہاتھوں دھجیاں کر کے   دیا رکھ میں نے آتش پر گریباں آستیں دامن
گئے کھا زخم اس کی گلی سے سیکڑوں لیکن   ہوا یوں خوں میں تر کس کا گریبانِ آستیں دامن
صفا سینہ کی یا ساعد کی یا ساق بلوریں کی   لکھوں ہے جس پہ خوشتر گریباں آستیں دامن
میرے اشکوں کے موتی ٹانکا اُن پر ہیں تیرے صدقے   کہ ہو ٹکموں سے زیبا در گریباں آستیں دامن
اٹھاتا ہے جو ہاتھوں سے بہ نشتر ہے درد کھانے   ہمیشہ وحشت کا تر گریباں آستیں دامن

ابھی تو خون کو میرے لذّتِ آغوش دیتے — خدا دھلوائیو رہ کر گریباں آستیں دامن
ہمیں آخر تو پھر اک پل میں انکو چاک کرنا تھا — بہت پچھتائے ہم سی کر گریباں آستیں دامن

• (قصیدہ در نعت محمد مصطفیٰ، جلد دوم

یہ صرف چند نمونے ہیں۔ کلیات میں اس قسم کے نمونے بکثرت موجود ہیں۔ ان میں سے بعض نادر خیالی کا اچھا نمونہ ہیں اور بعض میں جدت طرازی ہے آخری مثال ایک نعتیہ قصیدہ کی تشبیب ہے اور بظاہر عجیب سی بات ہے کہ نعتیہ قصیدے کی تشبیب میں عاشقانہ شعر لکھے جائیں۔ محسن کاکوروی نے جب اپنا مشہور نعتیہ قصیدہ:۔ ع

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

لکھا تھا اور اس کی تشبیب میں ایک نیا رنگ اختیار کیا تھا۔ تو بعض حضرات کو بھی اعتراض تھا۔ کہ آنحضرت صلعم کی مدح اور آغاز کفر کی تعریف اور بیان سے ہوتا ہے۔ لیکن ایسے موقعوں پر شاعر کا اصلی کمال گریز سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ مصحفی نے بھی اس عاشقانہ تشبیب کو اعلیٰ درجہ کی گریز سے بنایا ہے۔ اس کی وضاحت آگے "گریز" کے تحت آتی ہے۔

تشبیب نگاری کا ایک اور عام انداز "سراپا نگاری" کا ہے۔ غزل کے مضامین میں بھی محبوب کے سراپا کا ذکر موجود اور شامل ہوتا ہے۔ لیکن قصیدہ نگاروں نے ایسی تشبیبوں میں ایک ایسی پری چہرہ کا ذکر کیا ہے جو آکر خواب غفلت سے ہوشیار کرتی، اور ممدوح کی مدح سرائی پر آمادہ کرتی ہے۔ اس سراپا کو شعرا نے بڑی رنگینی سے نظم کیا ہے۔ اور یہ ایسا عنصر ہے جو قصیدہ

میں اور کسی مقام پر اس خوبی سے نہیں آ سکتا تھا۔ جو لوگ مدح کے مضامین ناپسند کرتے ہیں اور قصیدوں کو صرف اُن کی تشبیبوں کی خاطر دیکھتے ہیں اُن کے لیے یہاں خاص دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں ؎

کھُل گئے منہ پہ مرے شب جو در خواب کے پٹ   نظر آئی مجھے اک طرفہ بھبوکا نٹ کھٹ
حُسن کا اُس کے یہ عالم کہ پری دیکھ جسے   دوڑ کر لینے لگے وہیں بلائیں چٹ چٹ
دوش در آئینہ نور تھی چوں شمع   تن میں شیشے کی صفا چہرے میں شعلہ کی لپٹ
مدھ بھری چتون کے ٹپکتی ہے یہ اُس سے مستی   جسکی مستی مئے منصور کو سمجھے تلچھٹ
ناف تک سینہ میں اس پر وہ صباحت اُسکے   گویا مینے سے بنائی ہے وہ لعبت جھٹ پٹ
کرتی ہے جنبشِ مژگاں سے جبیں پہ چیں پیدا   بدن صاف میں پڑتی تھی نگہ سے سلوٹ
جھنگلے اور جھنجھوٹے سے اُسے ذوق زیاد   کبھی وہ رام کلی اور کبھی کالی ہے نٹ

• (قصیدہ در مدح شاداب علی خاں در جواب قصیدہ انشاء اللہ خاں)

شب دوشنبہ دکھی ہیں نے پلک پر جو پلک   اک پری کی سی شباہت گئی نظروں میں جھلک
نیم وا چشم خماریں کا یہ عالم اُس کی   جس طرح غنچہ نرگس کھلے اندک اندک
سر پہ نیلم کا وہ صاف دوپٹہ سادا   چاندنی دیکھ جیسے دُور سے رہ جائے جھوجک
سُرخی چشم سیہ کافر کی یہ عالم پیدا   جیسے شیشہ میں ہو رنگ مے گلگوں کی جھلک

• (قصیدہ در مدح سعادت علی خاں در جواب قصیدہ مرزا رفیع سودا)

برنگ غنچہ لب شرمگیں تبسم زا   جمال و حسن میں غیرت فزائے شمس و قمر
نگاہ سایہ مژگاں میں آہوے وحشتی   کرشمہ و نرگس فتاں میں ہمعناں شرار
دراز بندۂ ناپیچ کا برق خرمن ہوش   کہ جس کی قرص پہ خورشید کھائے تھا چکر

چڑھا ہوا وہ دہرے گلبدن کا پاجامہ   کہ جس کا رنگ شفق دیکھ رہ گئی ششدر

ہ (قصیدہ در مدح نواب روشن الدولہ بہادر)

مصحفی کی ان تمام تشبیبوں میں جس قدر تنوع پایا جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا۔ کہ باوجود مسکین نہاد اور درویش منش ہونے کے وہ اس فن کے لئے ہر طرح موزوں اور مناسب تھے اگر اُن کے ان فطری رجحانات سے قصیدہ کا کوئی حصّہ متاثر ہو سکتا تھا۔ تو وہ مدح کا مضمون تھا۔ اور واقعی یہ پہلو کچھ ہلکا ہے۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

تشبیب کے بعد "گریز" کا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی تشبیب کے مضمون کو چھوڑ کر شاعر مدح کا مضمون اختیار کرتا ہے۔ گریز کی خوبی اس کی بیساختگی پر منحصر ہے یعنی یہ تبدیلی ایسی قدرتی اور بیساختہ ہو کر پڑھنے والے یا سننے والے کو دو مختلف مضامین میں کوئی خلا نہ نظر آئے۔ مصحفی کی گریز اس معیار پر پُوری اُترتی ہے۔ نمونے ملاحظہ ہوں :۔

اپنے ایک قصیدہ میں جس کی تشبیب نقل ہوئی۔ مصحفی اپنے زمانہ کے شاعروں کی جہالت، لاعلمی اور اپنے شاعرانہ کلام کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں

مجھ کو بھی عروض آتی ہے نہ قافیہ چنداں   اک شعر سے گم دیدہ مرے پیر و جواں ہیں
سو کیوں نہ ہوں میں بھی تو ایسے کا ثنا خواں   جس کیلئے مخلوق یہ سب کون و مکاں ہیں
ماہ عرب امی لقب اعنی کہ محمد   نت جس کی طرف دیدہ انجم نگراں ہیں

اس کے بعد مدح شروع ہو گئی ہے۔

مرزا محمد تقی ہوس کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کی تشبیب میں اپنے

بخت کی نامساعدت اور زمانہ کا شکوہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

بس کب تلک تحمل بیداد روزگار   سینہ تو مارے ضبط کے ہو ہو گیا فگار
پہلوئے خشک میں مرے حالت یہ دل کی ہے   ماہی کوئی ہو جیسے کہ قلاب میں شکار
اس آسیائے چرخ نے اہل کمال کو   پیسا یہاں تلک کہ ہوئے استخواں غبار
برسوں تلک جو راست روی میں علم رہے   اب دیکھتا ہوں اُن کو ملتے ہیں پائے فگار
بہر خراش آبلۂ پا یہ کینہ جو   دیوے ہے نوک سبزہ کو تعلیم نوک خار
پائے فرار لنگ ہے میرا بھی کیا کروں   از بسکہ اسکے تیر جفا کا ہیں ہدف شکار
تدبیر سوجھتی نہیں الّا کہ جاؤں اب   ہو داد خواہ بر در نواب جم وقار
مرزا محمد تقی بعرف محمد تقی کہ ہے   ادنا مصاحب اُس کا فلاطون روزگار

یہاں بھی گریز میں وہی خوبی موجود ہے۔

ایک اور قصیدہ میں جو حضرت علی کی منقبت میں ہے مطلع یہ ہے:۔

ہو چکا دور میرؔ اور مرزاؔ   اب زمانہ میں دور ہے میرا

اس میں معاصرین کی شاعری اور اُن کے انداز پر تبصرہ کرنے کے بعد اپنے شاعرانہ کمالات کا بیان کیا ہے۔ اپنے حریفوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

میری اور تیری جو سچ پوچھے   نسبت سیل تیرہ و دریا
بطن مادر میں مجھ کو لکھتا تھا   امرء القیس افصح الفصحا
اور میں طفل ناکشودہ زباں   تھا امام زماں کا مدح سرا
وہ امام زماں جس کا نام   ہے کتابہ میں عرش کے لکھا

ایک قصیدہ کی فخریہ تشبیب میں لکھتے ہیں:۔

ملتا نہیں اُسکے پلہ میں ہوتا گر انوری   میرزا میرسے مجھے کیا ہے برابری

اس میں بھی اپنی شاعری پر فخر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :- ؎

لیکن میں اس پہ کچھ نہیں کرتا مفاخرت   گر فخر ہے تو در کی سلیماں کے چاکری

اور یہاں سے مرزا سلیمان شکوہ کی مدح شروع ہو جاتی ہے۔ مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں لیکن ان کا انداز یہی ہے۔

گریز کے بعد قصیدہ کا تیسرا مرحلہ "مدح" کا ہے۔ شاعر اپنی پوری قوت اس پر صرف کرتا ہے۔ اور بظاہر اسی کے زور پر صلہ کی توقع ہوتی ہے۔ افادی نقطہ نظر سے ممکن ہے۔ یہ قصیدہ کا ایک اہم جزو ہو۔ لیکن خالص شاعرانہ اعتبار سے یہ بالکل معمولی ہوتا ہے۔ اس میں مبالغہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ ایسے بیدست و پا بادشاہ کو بھی جو شاہ شطرنج سے زیادہ اقتدار نہ رکھتا ہو، ہفت اقلیم کا فرمانروا بنانا پڑتا ہے۔ سلیمان اسکے خدمت گزاروں میں اور دارا اور خسرو اس کے دربانوں میں جگہ پاتے ہیں۔ وہ چاہے گھوڑے پر سوار ہونا بھی نہ جانتا ہو۔ لیکن مشرق و مغرب اور شمال و جنوب پلک جھپکنے میں اس کے سمند بادپا کے سموں تلے آ جاتے ہیں۔ میدان جنگ میں اسے کبھی ہزیمت نصیب نہیں ہوتی۔ فتح، نصرت ہمیشہ اس کے قدم چومتے ہیں۔ رستم، اور ارجن اور بھیم سب اس کے سامنے عاجز ہیں عدل و انصاف میں نوشیرواں اس سے سبق لیتا ہے۔ سخاوت میں حاتم اُس کے سامنے شرمندہ ہے۔ علم و حکمت اور فضل و دانش میں ارسطو اور افلاطون اُس کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں غرض وہ ایسی خوبیوں کا

مجموعہ ہے۔ جو انسانی ذہن میں آ سکتی ہیں۔ لیکن کسی انسان میں آج تک جمع نہیں ہوئیں۔ قصیدہ کا یہ حصّہ واقعی مہذب بھبتی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ہاں کہیں کہیں اس میں گھوڑے، ہاتھی یا تلوار کی تعریف کرتے وقت شاعر سے کوئی اچھا مضمون ادا ہو جاتا ہے۔ فنی نقطہ نظر سے بس یہی اس حصّہ کا ماحصل سمجھئے۔ مصحفی کے یہاں بھی یہ تمام مضامین اسی رسمی انداز میں ادا ہوتے ہیں۔ بعض جگہ جہاں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار ہو گیا ہے۔ اس کے نمونے ملاحظہ ہوں:۔ ؎

تس پہ گھوڑے کی کہوں کیا میں سبک رفتاری   سطح خاک پہ جوں آب پہ چلتی ہو نسیم

(در مدح صفدر علی خاں)

گر اُسکے احتساب کا خطرہ نہیں تو پھر   جا کر چھپا ہے دیدۂ نرگس میں کیوں خمار
کشمیر کو گئی تھی صبا اُس کی بوئے خلق   صرف دعا ہے آپ تئیں واں پنجۂ چنار
سونڈ اُسکی دیکھ ٹنگی ہوئی یوں کہے ہے خلق   آغوش صبح میں ہے یہ گلدستۂ بہار
خورشید و ماہ سے کم نہیں پاؤں اُسکی جھول کے   تاروں پہ اسکے کرتے ہیں تارے گہر نثار

(قصیدہ مرزا محمد تقی ہوس)

اسکی مستک پہ ہے گجباگ کا جلوا اسطرح   کالے بادل میں نظر آوے ہے جسطرح ہلال

(ایضاً)

اس کے دانتوں پہ یہ کہتا کے فروغ بشرہ   شب تاریک میں روشن ہے دو دستی مشعل

(کلب علی خاں)

کلجگ ہاتھی پر اُسکے ماہ نو جوں چرخ نیلی پہ   دلے چاندی کا حوضہ تشکل بدر ذیل ظلماتی

جو کوئی دیکھتا ہے تجھ کو بیٹھا اُس میں کہتا ہے　　شناور نیل کے دریا میں ہے یہ یوسف ثانی

(نواب روشن الدولہ)

مدح کے جن مضامین کا ذکر اوپر ہوا وہ امرا- وزرا اور سلاطین کے قصیدوں میں ہوتے ہیں۔ مصحفی نے قصیدوں کی خاصی تعداد نعت اور منقبت میں بھی لکھی ہے۔ یہاں چونکہ دنیاوی صلہ کی تمنا شامل نہ تھی۔ نہ امارت اور لوازمات امارت کا تذکرہ ضروری تھا۔ اس لئے ایسے قصیدے اس عیب سے پاک ہیں اور اس کی جگہ متانت، پاکیزگی اور خلوص نے لے لی ہے۔ جس سے کسی حد تک دوسرے قصیدوں کا کفارہ ادا ہو گیا ہے۔

قصیدہ کی آخری منزل دعائیہ اور طلب ہے۔ اس کے مضمون بھی معمولی اور رسمی ہیں اور عام طور پر تین چار اشعار کہہ کر شاعر اسے ختم کر دیتا ہے۔ مصحفی کا اس بارہ میں کوئی علیحدہ یا امتیازی رنگ نہیں ہے۔

مصحفی کی کلیات میں کچھ متفرق اضافات بھی شامل ہیں۔ جن میں چند مسدس مخمس، مثمن، تضمین، ترکیب بند، ترجیع بند اور رباعیات شامل ہیں ان کے نمونے یہ ہیں :- ؎

اے کہ ہم بزمی اغیار خوش آئی ہے تجھے　　کیا کسی نے کوئی ترکیب دکھائی ہے تجھے
صلح غیروں سے میرے ساتھ لڑائی ہے تجھے　　وضع کس شوخ طرحدار کی بھائی ہے تجھے
ان دنوں تجھ کو مشوش بہت پاتا ہوں
بکھرے بالوں کو ترے دیکھ کے گھبراتا ہوں
بعضے کہتے ہیں کہ آسیب پری ہے تجھ کو　　بعضے کہتے ہیں پریشان نظری ہے تجھ کو

بعض کہتے ہیں زخود بے خبری ہے تجھ کو   بعض کہتے ہیں کہ درد جگری ہے تجھ کو
تہمت چند میاں تجھ کو لگا چاہتی ہیں
تیری آنکھیں تیری پلکوں کا بُرا چاہتی ہیں
اور ہی لوگ ہیں دنیا میں میاں حسن پرست   حوصلہ تم نے کہاں سے یہ نکالا یک دست
ہاتھ میں تیغ لیے پھرتے ہو جیسے بدمست   مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں آپ ہی آوے نہ شکست
کیونکہ دلّی ہے یہاں سینکڑوں خوں ہوتے ہیں
خانہ جنگوں کے علم جلد نگوں ہوتے ہیں
عاشقی شیوہ خوباں خوش اندام نہیں   عاشقی سے کوئی معشوق تو بدنام نہیں
تو دلآرام ہے کیا اور دلارام نہیں   مصحفی کے تئیں پر اس سے بھی کچھ کام نہیں
یہ سخن محض بھلائی کو تیری کہتا ہے
اور اس میں بھی بُرا مانے تو چپ رہتا ہے

●

پروانہ اور شمع میں چاہت نہیں رہی   بلبل سے گل کی گرمی صحبت نہیں رہی
مجنوں کے ساتھ لیلیٰ کی سنگت نہیں رہی   دنیا میں دل کو دل سے محبّت نہیں رہی
ہرگز کہیں دو شخص میں الفت نہیں رہی
ظاہر کی دوستی ہی رہی گو ہمارے ساتھ   اور نہ ہم اُسکے ساتھ پھریں وہ ہمارے ساتھ
پر یہ نہیں کہ کرم وفا ہو ہمارے ساتھ   اتنا رمیدہ خو ہے کہ اُس کو ہمارے ساتھ
الفت تو ایک طرف کہ خصومت نہیں رہی

●

اگرچہ تجھ سا زمانہ میں کیا نہیں کوئی پہ غرور یہ کیجیے تو صبر آزما نہیں کوئی
بایں کرشمہ و ناز و ادا نہیں کوئی ہزار نقشے ہیں ایسا بنا نہیں کوئی
تو ہی ہے بہتر صنع خدا نہیں کوئی تیری تشبیہ میاں دوسرا نہیں کوئی
بصورت تو نقشے کمتر آفریدہ خدا
ترا کشیدہ و دست از قلم کشیدہ خدا

•

ان اضافوں میں کوئی خاص شاعرانہ کمال نظر نہیں آتا البتہ رباعیاں جن کی تعداد خاصی ہے دلچسپ بھی ہیں۔ اور اہم بھی، ان میں سے بعض سے مصحفی کی زندگی کے خاص حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ اور بعض میں قدیم رباعیوں کے انداز پر عارفانہ مضامین نظم ہوئے ہیں۔ چند مثالیں اس کی وضاحت کے لئے کافی ہیں :۔

نادان گئے یہاں سے اور دانا بھی پیدا جو ہوئے ہوئے وہ ناپیدا بھی
ہے ہستی دنیا تو ہمارے دم سے جب ہم نہ ہوئے تو گو نہ ہو دنیا بھی

•

زاہد تو ہے طاعت سے خریدار بہشت پائے جاتے ہیں اس میں آثار بہشت
لیکن یہ گناہ گار ہے جو ہے اے یار نہ قابل دوزخ نہ سزاوار بہشت

•

باہم جو فلک کا ہے بندھا زنجیرا معلوم نہیں کہ اس میں ہے حکمت کیا
ہر چند کیے ہم نے بہت عقدے وا لیکن نہ کھلا ہم سے یہ گورکھ دھندا

ہم سمجھے تھے عمر کو یہ کب آخر ہے   پر غور جو کی کھلا یہ اب آخر ہے
اے مصحفی جاگے بہت اس بزم میں ہم   اب خواب ہی خواب ہے کہ شب آخر ہے

●

سمجھے ہیں درود سے بھی لعنت کو یہ خوب   یہ شیوہ نہیں طبع کے اپنی مرغوب
ہے مجلس شیعاں میں اک سُنی یوں   سو نکٹوں میں جیسے ناک والا معیوب

●

نہ شکوہ دور آسمانی کیجیے   اندیشہ نہ کچھ سود و زیاں کا کیجیے
اے مصحفی اب تو اس زمانے کے بیچ   جس طرح سے ہووے زندگانی کیجیے

●

اے وائے شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے   ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت   اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

●

مصحفی کو اپنی فارسی دانی اور فارسی گوئی دونوں پہ بڑا ناز تھا۔ اگرچہ ریختہ گو شعرا میں وہ میر اور مرزا کی استادی کا کبھی کبھی دبی زبان سے اعتراف بھی کر لیتے ہیں لیکن فارسی میں وہ ان میں سے کسی کو اپنا مد مقابل نہیں سمجھتے۔ ان کا فارسی کلام جو اس کلیات میں شامل ہے، یہ ہے

(۱) دیوان اوّل فارسی مشتمل بر غزلیات۔
(۲) دیوان دوم مشتمل بر قصائد۔
(۳) رسالہ مجمع الفوائد۔

(۴) نثر ہفت تصویر۔
(۵) خطبہ نشاط یانع۔
(۶) رسالہ در فضیلت انسان و بعضے جانوراں۔
(۷) مکتوب بطور تتبع مکتوب ملا ظہوری۔

ان کے علاوہ فن شعر میں ایک رسالہ اور کچھ کلام عربی میں بھی موجود ہے مصحفی کی فارسی غزلیں ان کی اردو غزلوں کی ہم رنگ ہیں ان کا موضوع عشق و عاشقی ہے۔ یا عارفانہ حرف و حکایت۔ البتہ خارجی رنگ کے مضامین جو اردو میں نسبتاً زیادہ ہیں فارسی میں بہت کم ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کا کلام یا تو منتخب ہے یا اس پر نظر ثانی ہو چکی ہے۔ فارسی میں مصحفی پر صائب یا کلیم کی بجائے سعدی اور حافظ کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ مضامین سادہ اور فطری ہیں اور ان کے لئے زبان بھی آسان اور دلنشین اختیار کی گئی ہے۔ اور اس سارے کلام کی لے اردو کی طرح یاس انگیز ہے۔ اس سے بھی مصحفی کے رجحانات اور ان کے افتاد طبع پر اسی رائے کی تائید ہوتی ہے۔ جو اردو کلام پڑھنے کے بعد قائم ہوتی ہے۔ فارسی غزلیات کا انتخاب ملاحظہ ہو:۔

چو طوفانِ فراقش برد بالا کشتیِ ما را   فقل یا عشق بسم اللہ مجریہا و مرسیہا
چو آمد کشتیم در ورطہ زیں دریائے طوفاں زا   فنا و العشق بسم اللہ مجریہا و مرسیہا
برو اے خنجرِ نازش قدم مستانہ مہمانی   نمیدانی تو اے ناداں مزاج یار بے پروا را

اے مشرقِ تجلی شوقِ تو سینہ ہا   اشراقِ عشق سوختہ اینجا سفینہ ہا
زاں کشتگاں کہ طعمہ طمعِ اجل شدند   فردا زمیں زخاک برآرد دفینہ ہا

•

قم الساقی طلوع الشمس خذ حیض و نادلہا   کہ در یک گردشِ پیمانہ آساں است مشکلہا
تو در خواب گراں افتادہ غافل چہ میدانی   کہ شب خیزاں راہ معرفت بستند محمل ہا

•

ہست در زمزمہ سوز دگر آواز ترا   ہر نوا زندہ ندارد روشِ ساز ترا
از بہرِ تماشائے گل و لالہ و سوسن   مرغاں بدر آرند سر از چاکِ قفس را
شہیدانِ محبت را زمیں افگند چوں پیراں   دریں موسم چہ پیش آمد ندانم لالہ کاراں را
در باغ گل کس ز بلبل شیدا نشاں نہ دید   تا سوخت برقِ آتشِ گل آشیانہ را
ہنگامِ فصلِ گل بگلستاں گزر مکن   کانجا زمیں بخاک برآرد خزانہ را
گر نالۂ اسیرِ قفس بشنود گہے   مرغِ چمن دگر نہ سراید ترانہ را

•

ز ہمدرداں کسے نزدیکِ من نیست   قبا بر جسمِ من غیر از کفن نیست
کشد موجِ ہوا خط بر عذارش   گلے ہرگز چنیں نازک بدن نیست
بدور افتادہ ام از یاراں بنوعے   کہ ہیچم یاد اکنوں از وطن نیست
ہنوز آں بیستون و تیشہ باقی است   مگر بازو و دستِ کوہکن نیست
سوادِ سرمۂ شامِ غریبی ہا   بچشمِ من کم از صبحِ وطن نیست

ز دیگراں چہ شکایت کنم عجب این است — بر آتشِ دلِ من گریہ ہم نہ آب انداخت
نسیم برگِ گل از چمن کشید بہ بیروں — شرارہ در قفسِ تنگ بلبلاں انداخت
قاصد باد سحرا ز طرفِ گل صد بار — بہر تسکینِ اسیرانِ قفس آمد و رفت
آدمی مشتِ غبارے بیش نیست — لمعہ ہستی شرارے بیش نیست
گل بچشمِ بے تو خارے بیش نیست — غنچہ ہا سنت شرارے بیش نیست
رشتہ آمد شدن ہائے نفس — در کفِ تقدیر تارے بیش نیست
آمد بہار و پیرہنِ غنچہ ہا درید — دستِ جنوں دگر بہ گریباں دو چار شد
گل کرد خندۂ بگلستاں کہ ناگہاں — آتش بآشیانہ مرغاں دو چار شد
دراں مقام کہ بود آشیانۂ بلبل — فتاد برقے و آتش دراں مقام کشید
کس چہ داند کہ بہ باغ آمد بہار — چہ قیامت بسرِ مُرغِ گرفتار آورد
تنہا بقفائے قافلہ ماندم زپے بیکسی — کردند دوستاں سفر زیں دیار حیف
اگرچہ داد بمن یار تلخ تر دشنام — بشہد غوطہ زد از لعل چوں شکر دشنام[1]
رسید فصلِ اسیری دمی طپید دلِ زار — سراغِ خانہ صیاد می تواں کردن
بلبل ز کد ایں گل خنداں گلہ دارد — کز نالہ او گوشِ گلستاں گلہ دارد
ہردم رُخِ خود بینی و اورا نہ رسی آہ — غافل ز تو آئینہ حیراں گلہ دارد
آہستہ قدم نہ بزمیں سرو خراماں — کز طرزِ خرامِ تو گلستاں گلہ دارد
افسانہ مرغِ قفس گوید بیاراں چمن — گر قاصد باد صبا طرف گلستاں بگذارد

فارسی نثر میں مصحفی کی تحریروں میں دو رجحان ہیں۔ اُن کے مطبوعہ تذکروں اور

---

[1] مرزا غالب نے بعد میں ذرا سے فرق سے یہ مضمون اس طرح ادا کیا ہے :-

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

غیر مطبوعہ مجمع القوائد کی زبان صاف اور سادہ ہے۔ اگرچہ اس عبارت میں زورِ بیان نہیں ہے تاہم اظہارِ مدعا کا مقصد اس سے پوری طرح حاصل ہو جاتا ہے تذکرے مطبوعہ موجود ہیں ان کا نمونہ دینے کی ضرورت نہیں۔ مجمع القوائد کا انداز حسبِ ذیل ہے۔ یہ عبارت اس موقع پر آئی ہے جہاں وہ اپنا حسب و نسب بیان کرتے ہیں۔

"اما چوں بعضے از دوستاں سوال نسب نامہ ایں عاصی پر معاصی داشتند بسکہ مثل آنہا مجہول النسب نہ بودم آنچہ از آباؤ اجداد بسمع فقیر رسیدہ بر صفحۂ اعلان می نگارم، باید دانست کہ موضع اکبرپور در میان موضع منجھاولی و شیخ پور کہ خاص مکان بود و باش اجداد من بود واقع است۔ ساکنان موضع گھرورہ ودکانو باہم متفق شدہ بہ سبب خصومت قدیم سکنۂ موضع مذکور را بقتل رسانیدند با زن و فرزند اناں جملہ مادر شیخ نظام الدین بسبب الفت مادری پسر صغیر خود را در کاہ کدہ از دست خود انداختہ پنہاں کرد و خود بقتل رسید، دشمناں در د آتش زدند اما حافظ حقیقی مثل خلیل او را در اں طوفانِ سوختن در زمانہ کشیدن نگہبانی کرد۔"

یہ وہی نظام ہیں جنہیں مصحفی نے اپنا جدِ اعلیٰ بتایا ہے۔

یہ ایسی فارسی ہے جس سے صاف "بوئے کچہری" آتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کا استعمال اس زمانہ میں محض کاروباری تحریروں میں ہوتا ہے۔ علمی اور ادبی تصانیف کے لیے پھر بھی مرصع اور پرتکلف عبارت کا رواج تھا چنانچہ مصحفی کی دوسری تحریروں سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ ایک رنگ

ملا ظہوری کا ہے۔

" اس مکتوبے است بطور پنج مکتوب ملا ظہوری، اس فقیر خاکسار مصحفی تصنیف نمودہ؛ سر بر زانو نہادہ کنج غم فکر خیال محال و دست بر زانو زدہ تاسف بیرون آمدن دولت وصال شمع تا سحر سوز بزم ناکامی جاوید چراغ صبح افروز کوتاہی امید بسمل بخون طپیدہ قتل گاہ میدان جانسپاری وہم ذبح دم فرو کشیدہ زیر دم خنجر زہر آبدادہ ناگواری مشت خاک بر باد دادہ صرصر تند فراق ناگہانی و خاک ندامت بر سر ریختہ والف سینہ کشیدہ تیغ اداہائے سینہ انگیختہ رخسارہ بخون شستہ مشہد تمنائے کامیابی و گلو بہ تیغ تجربہ نہادہ مقتل رنگین بے حجابی خرمن سوختہ برق حسن گلو سوز ساقی صراحی گردش دو دانہ اندوختہ خرمن کوہ کوہ اندوہ و رنج و محن گلاب پاش نعش آرزو ہائے مردہ از دیدہ گریان و صندل مال جبہ نیاز خون از دست گرفتہ بن مژگان زندانی چشم دوختہ رہائے عید قربان جان بجانان دادن و اسیری ما بہم پیچیدہ امیدوار قفس بہ گلستان نہادن و بہ بت از جہان نشستہ بر خوان نگاہ مہربانی قاتل و سینہ بآب دادہ آشنائی دریائے بے ساحل مہر سکوت بہ لب نہادہ ہنگامہ رستخیز نالہ و زاری و دندان بجگر افشردہ شور شورا محشر بیقراری، آستین بچشم کشیدہ ماتم آرزوہائے دیدار و دامن بکمر زدہ مسافت بادیہ دشوار گذار خار خار دل گرفتہ تصور مژگان در زیر بار ضیا خمیدہ و بار تار گردیدہ از فراق گیسوئے پیچان مال بتار پیچیدہ شیشہ بر سنگ شکستہ بیستون رسوائی و ساغر از دست دادہ سنگ لاخ بینوائی کوچہ گردی پا و سر دیار وحشت و جنون چون گل و صد خندہ زیر

لب دزدیدہ از پاس بے مہری گردوں چوں جام مل بغرض گلچکاں باغ وصال دتو یہ کردگاں بہار جمال می رساند کہ تا ازاں حباب ثریا قباب کہ صد کعبہ جاں بلا گرداں اوست دور افتادہ ام نہ تن تن ماندہ است نہ جاں جاں۔"[لہ]

دوسرا نمونہ "نثر ہفت تصویر" سے ہے :-

"نثر ہفت تصویر کہ در ایام قرب میاں بشارت علی خاں نوشتہ بودم، فائدہ تصویر اوّل کہ چوں ماہ چاردہ بکمال حسن و خوبی در چادر سپید سیماب گوں شدہ پائے خود را پیچیدہ از غایت ناز و تمکین آہستہ آہستہ قدم برفتار میکشاد"

ہذا شرحی متقیم نگار: بدنیت کہ در راستہ بازار جوہر فروشاں حسن خود را بہ لباس دلالگی در آوردہ از مشتریاں خوبی جمالش بہائے بے بہا می خواہد و دلّال چشم روزگار نیست کہ پیش دوکانہائے چارسوئے غنج و دلال رہنمائے خریداراں جان برکف را اشعار خود ساختہ ہر نفس دفتر تقریر تازہ میکشاید قضا کار را روزے سر بازارش افتاد از پیش نگاہم صورتے گذرانید کہ چشم زبان قلم نزاکت رقم تشبیہ کشاں عالم خیال غالب کہ ایں چنیں تشبیہ بر صفحہ ایجاد بہ بالیدگی حسن و جمال ندیدہ باشند و خامہ سحر کار مانی و بہزاد و دیگر صورت گراں چنیں کہ صورت سازی ید بیضا دارند و جاں بقالب بیجاں می بخشند بر شقہ خیال نہ کشیدہ، بالیدگی حسنش در ہر عضو از بالیدگی برگ گل صد تو بالا تر و صقلئے جسم شبابش در ہر گام ازخی نشانی عرق رخسار یا نعرہ گوہر مرغوب الطبع و محبوب القلوبی کہ ہر گدا از نیک و بد و از فاسق و عفیف نظر پروردش در ہر گام انداختہ کارش بیک کرشمہ نقطہ سہو بقلم نوک مژگاں تمام

[لہ] کلیات صفحہ ۳۲۵

ساختہ تا خطِ مستقیم نگاہ را از سطحِ آئینہ حسن دلفریبش طاقتِ انحراف نیست و کرۂ ناری و ہوا را پیشِ لطافتِ شعلۂ حسنِ ہوادارش امکانِ لطف و گزافت نہ۔

ہر چند کہ نثر نگاری کا یہ اسلوب اب مطبوع اور مروج نہیں رہا اور اس کی جگہ ایک سادہ اور بے تکلیف انداز نے لی ہے لیکن مصحفی کے زمانہ تک اس کی قدردانی باقی تھی۔ اس کا سب سے بڑا عیب طولِ کلام ہے لیکن اس سے نثر نگار کی قوتِ تحریر اور ذخیرہ الفاظ کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اس تحریر میں ایک خوبی البتہ نمایاں ہے اور وہ رنگینیِ بیان اور رعنائیِ خیال ہے۔ اب جبکہ فارسی کا مذاق بالکل اُٹھتا جا رہا ہے۔ یہ توقع نہیں کہ مصحفی کی فارسی نظم اور نثر کی کماحقہ قدردانی ہو۔ لیکن جسے مصحفی کی ہمہ گیر شخصیت، اُن کی اُردو غزل، مثنوی اور قصیدے کو سمجھنا ہو وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔

فارسی میں ایک اور رسالہ خطبہ نشاط بازغ ہے یہ ایک طرح کی ادبی ڈائری ہے۔ اس میں مصحفی نے بعض علمی اور ادبی مجلسوں کا ذکر کیا ہے جن میں وہ خود شریک رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس عہد کے امرا کی محفلوں میں کس قسم کے لوگ جمع ہوتے تھے اور ان کی گفتگو کا موضوع کیا ہوتا تھا۔

نواب سوال کرد از مصاحبان دانشور کہ فرق در رفتارِ فیل و اسپ چیست۔ ہمہ درماندند۔ آخر خود فرمودند کہ فیل پائے راستِ خود را اوّل

می جنبانند بعد ازاں پائے دوم و بعد ازاں پائے طرف چپ، و اسپ ہر دو پائے اوّل را و بعد ازاں پائے پسیں را، ایضاً، نواب صاحب پرسیدند۔ کہ قوت باصرہ مفرق انصور و الوان است و تشکل و او ہمیّت را در می یابد و ایں ہمہ سہ چیز شدند۔ یعنی اشکال و اضواء و اوہمیّت، آں چیز چہارم کدام است کہ او را ہم نظر محسوس می کند من ایں ہر سہ و نظر می آید، مولوی مستقیم فرمودند کہ آں وجود ہوا است کہ مبصر بصر است۔ و مصحفی جواب میدہد بقول بعضے از حکما کہ فلک را وجودے نیست کہ مرئی شود۔ چراکہ صانع آنہا را از باد و ہوا لطیف ساختہ بلکہ آنچہ بنظر می آید۔ منّت ہائے ہمیں نگاہ است[۵۰]

مصحفی ان استادوں میں ہیں جنھوں نے اُردو شاعری کے میلانات پر دور رس اثرات ڈالے۔ اُن کی مشق شاعرانہ کی شہرت اُن کے زمانہ میں ہی اتنی ہو چکی تھی۔ کہ اکثر شعرائے وقت نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے۔ چنانچہ یہ بات عام طور پر مشہور رہے۔ کہ جس قدر شاعر مصحفی کی تربیّت سے فیضیاب ہوئے۔ اُردو کے کسی دوسرے شاعر کو نہ ملے ان میں سے بعض خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مثلاً میر خلیق جو اپنے والد میر حسن کی تحریک پر ان کے شاگرد ہوئے۔ میر حسن کی اُستادی خود مسلم ہے ان کا اپنے صاحبزادے کو مصحفی کی خدمت میں بھیجنا اور شاگرد کرنے پر اصرار کرنا ایک معاصر کا ایسا کمال اعتراف ہے۔ جس کی مثال شاعروں میں ذرا کم سی ہے۔ خلیق کا اثر میر انیس تک پہنچا۔ اور اس خاندان نے اُردو زبان اور شاعری کی جو خدمت کی اس کی تفصیل کے لئے ایک علیحدہ دفتر درکار ہے

---

[۵۰] کلیات صفحہ ۳۳۱

یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا کافی ہوگا کہ جس طرح مصحفیؔ نے خود اپنے دامن کو لکھنؤ کی عام فضا سے بچایا ہے۔ اسی طرح خلیقؔ اور انیسؔ دونوں نے صحت مذاق اور متانت و اخلاق کا لحاظ رکھا ہے جس طرح مصحفیؔ نے جذبات نگاری کو متعلقات حسن کے بیان پر ترجیح دی ہے۔ اسی طرح انیسؔ اور خلیقؔ نے اس خاص روش کو ملحوظ رکھا ہے۔ دوسرے شاعر آتشؔ ہیں۔ جن کا ذکر مصحفیؔ نے اپنے تذکرہ ریاض الفصحا میں شامل کیا ہے اور ان کی ابتدائی مشق پر نظر کر کے پیشین گوئی کی ہے۔ کہ اگر یہی انداز رہا تو شاعر کامل بن جائے گا۔ مولانا محمد حسین آزادؔ اور مولانا حسرتؔ موہانی نے لکھا ہے۔ کہ ناسخؔ نے بھی ان سے فیض پایا تھا۔ لیکن مصحفیؔ خود ناسخ کے بیان میں خاموش ہیں اس لئے یہ یقینی نہیں۔ آتشؔ کی شاگردی البتہ مسلم ہے۔ اور یہ عام طور پر معلوم ہے۔ کہ ناسخ کے مقابلہ میں آتشؔ کے کلام میں گرمی اور تاثیر زیادہ ہے۔ اور اس کا سلسلہ بھی مصحفیؔ کے فیض سے ملتا ہے۔ مرزا دبیرؔ بھی میر ضمیرؔ کے واسطہ سے انہیں کے شاگرد ہیں۔ متاخرین شعرائے لکھنؤ میں اسیرؔ امیرؔ اور جلیلؔ سب کا سلسلہ ان تک پہنچتا ہے۔ مولانا حسرتؔ موہانی کا سلسلہ دوسرا ہے۔ لیکن مصحفیؔ کے کلام سے انہوں نے بھی فیض پایا ہے۔ اور اس کا اعتراف کیا ہے اور یہ تمام وہ لوگ ہیں جن سے لکھنوی رنگ کا بھرم قائم ہے۔ اور جنہوں نے اردو زبان اور شاعری کو اس منزل تک پہنچایا جہاں سے پھر حالیؔ۔ اکبرؔ۔ اور اقبالؔ کا دور شروع ہوجاتا ہے۔

مصحفی کے کلام پر رائے دیتے ہوئے حسرت موہانی لکھتے ہیں :-

"مصحفی کی ہمہ گیر طبیعت نے کسی خاص رنگِ سخن پر قناعت نہ کرکے مشاہیر شعرائے متقدمین و متاخرین میں سے تقریباً ہر ایک کے اندازِ سخن کا پسندیدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں کہیں میر کا درد ہے تو کہیں سودا کا دبدبہ۔ کسی مقام پر فغاں کی رنگینی ہے تو کسی جگہ سوز کی سادگی کہیں واقعات میں جرأت کی سلاست اور حقیقت نویسی سے کام لیا گیا ہے۔ تو کہیں ترکیب الفاظ اور انداز بیان میں انشا کا طنطنہ اور جبروت صرف ہوا ہے۔ کہیں پر غزلوں کو قطعاتِ مسلسل پر ختم کرنے میں جعفر علی حسرت کا رنگ کلام پیش ہوتا ہے۔ تو کہیں مشکل ردیف قافیوں کو بخوبی و صفائی نباہتے ہیں۔ تو شاہ نصیر کا کمال سامنے آجاتا ہے، اور پھر ان کے علاوہ جن غزلوں اور بیتوں میں ان تمام اساتذہ کی خوبیوں کو انکی کہنہ مشقی اور استادی یکجا کر دیتی ہے۔ تو ان کا شمار لاریب اردو شاعری کے بہترین نمونوں میں کیا جا سکتا ہے۔ مصحفی کی زبان اگرچہ میر و سودا کی قدیم زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ لیکن اس درجہ شیریں اور سبک واقع ہوئی ہے اکثر اس کی حلاوت اس زمانہ میں بھی ناظرین کے دلوں میں اس کے متروک الاستعمال ہونے کا گمان نہ پیدا ہونے دے گی . . . ان غزلوں کے دیکھنے سے ثابت ہوگا۔ کہ میر تقی کے رنگ میں مصحفی میر حسن کے ہم پلہ سودا کے انداز میں انشا کے ہم پایہ اور جعفر علی حسرت کے رنگ میں جرأت کے ہمنوا ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان سب ہم عصروں سے باعتبار کمال

سخندانی و مشاقی برتر ہے۔ اور یہیں سے ہے کہ راقم کی نظر میں میرؔ اور مرزاؔ کے بعد اور کوئی اُستاد ان کے مقابلہ میں نہیں جچتا۔"

باوجود ان کمالات کے مصحفی اپنے زمانہ میں اس گردش فلک کا شکار رہے جو اہل کمال کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ وہ قدردانی سے محروم ایک بے روغن چراغ کی طرح ٹمٹماتے رہے۔ یہاں تک کہ قضا کے ایک جھونکے نے وہ دیا بھی بجھا دیا۔ مصحفی کا کلام اب بھی زندہ اور تر و تازہ ہے۔ عشق کی گرمی اور محبت کا سوز اب بھی اُن اوراق میں دوڑ رہا ہے۔ جو اس غیر مطبوعہ کرم خوردہ ناتمام اور ناقص کلیات میں ناقدری پر مرثیہ پڑھتے۔ کسی دن اشاعت کی توقع میں باقی رہ گئے ہیں ؎

گر مصحفی بدیدۂ انصاف بنگری
خوشتر زمن کجاست زبان دان ریختہ

تمت بالخیر

سلسلہ مصحفی نمبر ۱

شاگردانِ مصحفی

(۱) اسیر (۲) خلیق (۳) ضمیر (۴) تمہیدی (۵) تنہا (۶) جوشش (۷) جان (۸) رنگین (۹) صبا (۱۰) عظیم (۱۱) فدا (۱۲) قسمت (۱۳) گرم (۱۴) متحمل (۱۵) منتظر (۱۶) نالاں (۱۷) والہ (۱۸) سلیمان شکوہ (۱۹) الٰہی (۲۰) اندہ (۲۱) اظہار (۲۲) اخگر (۲۳) ادیب (۲۴) بیاں (۲۵) بندہ (۲۶) تائب (۲۷) تمنا (۲۸) تمیز (۲۹) حریف (۳۰) حسام (۳۱) حباب (۳۲) حاذق (۳۳) خرم (۳۴) خاں (۳۵) ذوق (۳۶) ذاکر (۳۷) رعنا (۳۸) راقم (۳۹) رافت (۴۰) زیبا (۴۱) ساماں (۴۲) ساحر (۴۳) سپند (۴۴) شفق (۴۵) شمیم (۴۶) شگفتہ (۴۷) شوق (۴۸) شکیب (۴۹) شعور (۵۰) طپاں (۵۱) ظہور (۵۲) ظریف (۵۳) عیاش (۵۴) عاصی (۵۵) عدل (۵۶) عارف (۵۷) عاصم (۵۸) عاقل (۵۹) فرد (۶۰) فرہاد (۶۱) فاخر (۶۲) مائل (۶۳) مظفر (۶۴) مخمور (۶۵) موجی (۶۶) مست (۶۷) مسرور (۶۸) مفتون (۶۹) نزہت (۷۰) نگہ (۷۱) نشتر (۷۲) نحیف (۷۳) نادان (۷۴) نظر (۷۵) وحشی (۷۶) واجد (۷۷) رونق (۷۸) ہوس (۷۹) ہنر (۸۰) یاس (۸۱) افسر (۸۲) بیباک (۸۳) تسلی (۸۴) شاد (۸۵) صیا (۸۶) صبا (۸۷) فدا (۸۸) مخلص (۸۹) نالاں۔

سلسلہ اسیرؔ[۱] (سلسلہ مصحفیؔ ۲)

شاگردانِ اسیرؔ

(۱) امیرؔ مینائی (۲) شوقؔ قدوائی (۳) سندؔ لکھنوی (۴) فضلؔ (۵) انجمؔ (۶)
ادیبؔ (۷) اصغرؔ (۸) افسوسؔ (۹) احسنؔ (۱۰) اعجازؔ (۱۱) تبسمؔ (۱۲) جعفرؔ (۱۳) حکیمؔ
(۱۴) حزیںؔ (۱۵) درخشاںؔ (۱۶) واسطیؔ (۱۷) رضاؔ (۱۸) سلطانؔ (۱۹) شوقؔ (۲۰) ظہورؔ
(۲۱) ظہورؔ (۲۲) عاقلؔ (۲۳) عابدؔ (۲۴) عقیلؔ (۲۵) فروغؔ (۲۶) فوقؔ (۲۷) کوثرؔ
(۲۸) لطیفؔ (۲۹) منصبؔ (۳۰) مضطرؔ (۳۱) نجمؔ (۳۲) نادرؔ (۳۳) وحیدؔ
(۳۴) ہوشؔ (۳۵) ہجرؔ (۳۶) یوسفؔ (۳۷) ہنرؔ (۳۸) فداؔ (۳۹) احسنؔ
(۴۰) صغیرؔ (۴۱) عاقلؔ۔

سلسلہ امیرؔ مینائی (سلسلہ مصحفیؔ ۳)

(۱) جلیلؔ (۲) ریاضؔ (۳) مضطرؔ (۴) دلؔ (۵) شررؔ (۶) جگرؔ بسوانی (۷)
حسرتؔ شروانی (۸) ناطقؔ (۹) خلیلؔ (۱۰) فصیحؔ (۱۱) قمرؔ (۱۲) ثاقبؔ (۱۳)
وفاؔ (۱۴) آرامؔ (۱۵) احمدؔ (۱۶) امجدؔ (۱۷) اخگرؔ (۱۸) بسملؔ (۱۹) حافظؔ (۲۰) حافظؔ
(۲۱) حسرتؔ (۲۲) حسنؔ (۲۳) خردؔ (۲۴) سرخوشؔ (۲۵) سلیمؔ (۲۶) سعیدؔ (۲۷)
ضابطہؔ (۲۸) ضبطؔ (۲۹) عاصیؔ (۳۰) فداؔ (۳۱) لطافتؔ (۳۲) مرتضیٰ۔

---

[۱] ماخذات، انتخابِ سخن حسرتؔ و متفرق تذکرہ جات۔

(۳۳) مشتاق (۳۴) ممتاز (۳۵) مہر (۳۶) واحد (۳۷) آہ (۳۸) انداز (۳۹) بہار (۴۰) بسمل (۴۱) خلیل (۴۲) راز (۴۳) شمیم (۴۴) عاقل (۴۵) غریب (۴۶) مظہر (۴۷) مصباح (۴۸) نواب کلب علیخاں (۴۹) نشتر (۵۰) نسیم (۵۱) ہاشم (۵۲) ماہر ۔

سلسلہ فائز (سلسلہ مصحفی ۴)

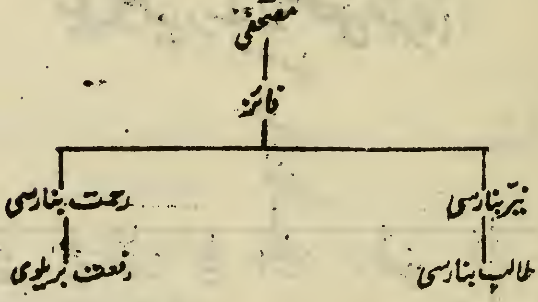
مصحفی
فائز
نیر بنارسی
طالب بنارسی
رحمت بنارسی
رفعت بریلوی

سلسلہ خلیق (سلسلہ مصحفی ۵)

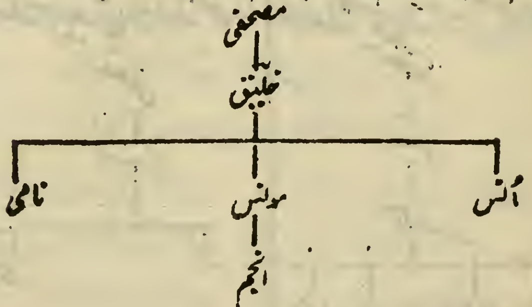
مصحفی
خلیق
آتش
مونس
انجم
نامی

سلسلہ آتش (سلسلہ مصحفی ۶)

شاگردان آتش: نمبر(۱) شوق (۲) نسیم (۳) رند (۴) صبا (۵) اکرام (۶) اعظم (۷) سرور (۸) منتہی (۹) الم (۱۰) یاس (۱۱) ظہور (۱۲) افگار (۱۳) خلیل (۱۴) وحید (۱۵) تسلیم (۱۶) اوج (۱۷) آغا حجو

سلسلہ ضمیر (سلسلہ مصحفی نمبر ۷)

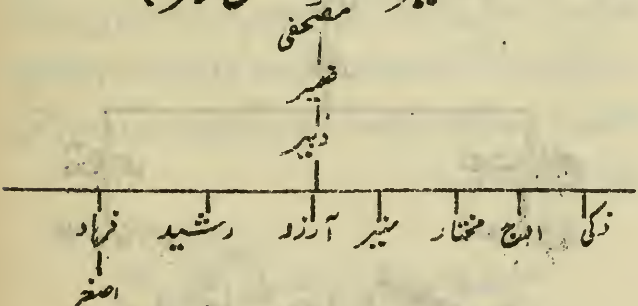
مصحفی
ضمیر
دبیر
ذکی
اوج
ممتاز
منیر
آرزو
رشید
فرہاد
اصغر

سلسلہ شہیدی (سلسلہ مصحفی ۸)

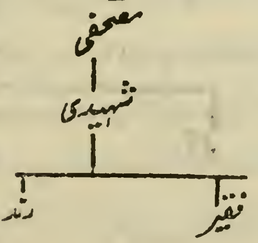
مصحفی
شہیدی
فقیر
رند

سلسلہ عیشی (سلسلہ مصحفی نمبر ۹)

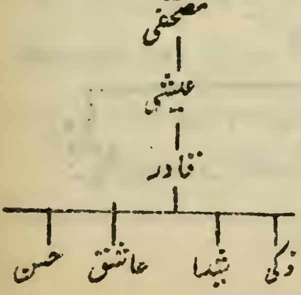
مصحفی
عیشی
نادر
ذکی
شیدا
عاشق
حسن

انتخاب کلام مصحفی

لگے گر ہاتھ میرے تار دامن زلف عنبر کا
تو ہووے باعث شیرازہ ان اجزائے ابتر کا

پڑے ہے کشتی جب تیری آنکھوں کو دکھاتا ہے
ستارہ تب چمکے ہے خورشید گردش میں ساغر کا

وہ میں بیتاب تشنہ لب ہوں کہ جس کی تشنہ جانی سے
ہوا جاتا ہے دم برگشتہ وقت ذبح خنجر کا

اڑے ہے بسکہ دل اپنا میرے نامہ بہ پردانی
پھرا کرتا ہے بیچارا بال بندھے جیسے کبوتر کا

وہ خاکستر نشیں ہوں میں کہ شعلہ خیز آتش
نہ مجھ کو فکر بالاپوش کا ہے اور نہ بستر کا

کلیجہ چھن گیا ہے آہ و نالے سے میرا یہاں تک
کہ اب جو دم نکلتا ہے تو جیسے دود مجمر کا

نہ ہوگی پیاس کے وقت ہرگز تشنگی غالب
کہ تو اے مصحفی مداح ہے ساقی کوثر کا

خداوندا نہیں مشتاق میں سرو صنوبر کا
رہے تا حشر میرے سر پہ ہو سایہ سمن بر کا

گیا ہوں جان سے تو بھی تڑپنا ہے مجھ میں باقی
خدا جانے کہ میں مجروح ہوں کس دست خنجر کا

پڑا رہتا ہے اکثر راہ میں اُن دامن درازوں کے
یہ سر مشتاق ہے کیا جانے کن پانوں کی ٹھوکر کا

جواب نامہ تو معلوم اُس کے پاس سے آنا   کوئی پر اُڑتے اُڑتے شاید آ پہنچے کبوتر کا
غرض ہر وقت روتے ہی رہتے ہیں ہم دل کے ماتم میں   نہ سوکھا ایکدم رومال اپنے دیدۂ تر کا
مری آنکھوں سے گر پڑتے ہیں آنسو بیچ مجلس کے   چھلکنا جبکہ ساقی مجھ کو یاد آتا ہے ساغر کا
گئے دن مصحفی ہمسایہ ٹک سُکھ کی نیند سوتے تھے
کیا نالوں نے میرے پھر بپا ہنگامہ محشر کا

روز رومال نیا دیدۂ تر پر رکھا   ایک بہایا نہیں تا سو جگر پر رکھا
میں اسی رشک سے مرتا ہوں کہ کل غیر نے ہائے   ہاتھ ہنگام قسم کیوں ترے سر پر رکھا
جب پڑا داغ چمن میں جو کوئی لالہ کا   ہم نے وہ داغ اُٹھا اپنے جگر پر رکھا
کیوں نہ دل دیکھ اُسے ہاتھ سے جائے یکبار   ایسے ہی ناز سے ہاتھ اُن نے کمر پر رکھا
کیا بُرائی ہو جو رہے مصحفی نت یہاں بیٹھا
تم بھی جانیو دربان ہے در پر بیٹھا

جب سر انگشت کو میں دیدۂ تر پر رکھا   نام آنسو نے مرے سلک گہر پر رکھا
مارے بیتابی کے آیا مرے منہ تک ہر چند   دست تسکین میں بہت اپنے جگر پر رکھا
اُسکی آنکھوں کو نہ دیکھا کبھی دیندار ولے   جرم نظارۂ عبث میری نظر پر رکھا
وعدہ خالی نہ ہوے تو بھی کہ کل وعدہ کر   غیر سے شام ملا ہم کو سحر پر رکھا
کیا بچونگا میں کہ دل کے مرے خمیازوں نے   ایک ٹانکا نہ مرے زخم جگر پر رکھا
کیا کروں شکر ادا آپکے آنے کا کہ رات   جو قدم تمنے کہ رکھا مرے سر پر رکھا
مصحفی چاہیے کیا پھر اُسے اُٹھ چلنے کو
جس مسافر نے کہ دل اپنا سفر پر رکھا

شب جو اُس نے قدم اپنا مرے سر پر رکھا — میں نے سر پہ سے اُٹھا دیدۂ تر پر رکھا
تیرے بیٹھے جو ہمیں یاد بھی آیا کوئی کام — ہم نے موقوف اُسے وقت دگر پر رکھا
چونک اُٹھا وہ کہ تمہیں خیر ہے منہ سے واہ — شب جو میں دستِ خیال اُس کی کمر پر رکھا
شوق نظارہ دیا ہے تیرے شب [illegible] — تا سحر دیدۂ [illegible] قدم پر رکھا
پیار کرتے ہو مرے داغ کا اُتر اُٹھا کہہ کر — سمجھے لالہ نے اُسے اپنے جگر پر رکھا
کچھ ادا دیکھیں کہ گل کھینچ کے اُس کا قر سے
نیمچہ مصحفیِ خستہ کے سر پر رکھا

سو سو طرح کا حادثہ تجھ پر گزر چکا — پر اے دل ایک روز کہیں تو نہ مر چکا
اتنا بھی خال و خط کا بناتا ہے کیا میاں — بس دیکھ آئینہ کہیں، مکھڑا سنور چکا
قیمہ کریگا کیا کہیں اب مجھ سے ہاتھ اُٹھا — تا قبضہ نیمچہ تو ترا خوں سے بھر چکا
اس ہاتھ سے یہ دل نہ تسلّی ہوا دریغ — سو مرتبہ میں دل کے اوپر ہاتھ دھر چکا
اے یار وقت چہرہ خراشی دو ہو گئی — کیا کیا نہ تیرے ہاتھوں سے مجھ پر گزر چکا
ایک سر پہ خاک ڈالنی باقی رہی ہے سو — دیکھو گے شام و صبح کہ میں وہ بھی کر چکا
کتنا ہی ہیں نیسار دل اُسے لیک مصحفی
نقشہ اگر یہی ہے تو جی سے بسر چکا

آج کچھ سینہ میں دل ہے خودبخود بیتاب سا — کر رہا ہے بیقراری پارۂ سیماب سا
جوں گل تر کیا ہی اُس سے جھلکے ہے اُس کا بدن — وہ جو پیراہن ہے تن میں اُس کے ہے اک آب سا
یاد میں کس غنچہ لب کی میں بنا ہوں کہ آج — جو سرشک آنکھوں سے گرتا ہے سو ہے عناب سا
میں ہوں اور خلوت ہے اور پیشِ نظر معشوق ہے — ہے تو بیداری ولے کچھ دیکھتا ہوں خواب سا

کوزہ وہ شراب وشیر زیر زمیں ہے آدمی	جنبش رنگ سے ہوا آسماں گردش میں آئی دولاب سا
کل شب نہ بایک پوشش تنہا آئی وہ بے نقاب	جلوہ گر مہ سے زمیں پر ہو گیا مہتاب سا
کیا کہوں حسن و لطافت جان تن میں تیرے ہے	نکلا ہی پڑتا ہے وہ گورا بدن مہتاب سا
مصحفی بیدل محبت دل میں کا کھاتا ہے قسم
ہے تمنا یار کچھ تو آنکھوں میں تری خوں ناب سا

جی جائے گا یا گماں کسی کا	یوں کرتے ہیں امتحاں کسی کا
کھولے ہے نقاب منت اُٹھاؤ	کیا فائدہ ہو زباں کسی کا
جس راہ وہاں کوئی گزر گیا	پھر بس نہ چلے جہاں کسی کا
ہو دیکھ فرشتہ اُس پہ عاشق	ہوتا ہے وہ بدگماں کسی کا
آزردہ کئے ہیں اس طرح واہ	دل مفت ہیں اے میاں کسی کا
اے مرغ چمن یہیں نہ کر شور	قطعہ ہے یہ اشنب گلستاں کسی کا
تا فصل دگر رہا نہ ہرگز	اس باغ میں آشیاں کسی کا
دیتے نہیں مصحفی پھر اُس کو
دل لیویں جو یہ بتاں کسی کا

شب کہ دل درد والم سے سر بسر لبریز تھا	شور محشر کی طرح ہر نالہ شور انگیز تھا
الاماں دل کو کوئی مارا ہے جسے کس طرح آ گئے	اس نے ایسے گرم جوشی کی کہ وہ پرہیز تھا
ایک ہی تیشے میں قصہ فرہاد کا دو ہو گیا	کیا کرے فرہاد بیچارہ کہ تیشہ تیز تھا
تو بہاراں میں جو کرتے ہم بھی دعوائے جنوں	مثل گل چاک گریباں ہم کو دست آویز تھا
کی نہ تک اک آب دم شمشیر قاتل نے کبھی	ورنہ پیمانہ ہماری عمر کا لبریز تھا

اولیاؤں کو بھی کھینچا اُس نے آخر زیرِ تیغ   تو کہے وہ قاتلوں میں عصر کا چنگیز تھا
لے تہوں کو مصحفی مر کر نہ سوجھا ورنہ یہاں
رنگ خوں دل میرا ہر اشک میں آمیز تھا
عاشقِ بیدل تو مشتاقِ نگاہِ تیز تھا   ہاتھ میں گو اسکے یارو تیغچہ زنگریز تھا
ایک نگہ کے نیچے جیسے نیم بسمل کر گیا   قہر تھا آفت تھا دیکھا تھا کمی خونریز تھا
ہم نے بھی کچھ اپنی دانائی سے یہ کی واسطے   ورنہ جو کانٹا تھا اس وادی کا سو سرتیز تھا
ایک دم میں کر دیا یوں اُس کی نشتر سے جدا   خنجرِ شیرویہ کب کا دشمنِ پرویز تھا
وہ جو خط بھیجا تھا تو نے چاک کر میرے تئیں   میں جو دکھلایا تو مجھ کو وہ بھی دستاویز تھا
گھر میں ہمسایہ نہ سوئے ایک شب آرام سے   حسن اس رشکِ پری کا بسکہ عشق انگیز تھا
کہتے ہیں دیکھو اُس کی صورت مصحفی کل مر گیا
کیا عجب اُس کا کہ تھا بیمار و بد پرہیز تھا

کچھ اعتماد ان کے نہیں ارتباط کا   ہرجائیوں سے فائدہ کیا اختلاط کا
کلبے کو بیٹھوں جا کے میں وہاں کام کیا میرا   جس بزم میں کہ ذکر ہو عیش و نشاط کا
واشد کی آسماں سے کچھ امید ہی نہیں   روزِ ازل سے بند ہے در اس رباط کا
مستی سے گو کہ ہیں دمِ شمشیر پہ گردن   کب ہے خیال اُس کو مری احتیاط کا
گردوں پہ یہ شفق نہیں دیکھا تو مصحفی
خونِ شہاں سے سُرخ ہے رنگ اِس بساط کا

جب سرِ زلفِ صنم خم کھا گیا   کہ ایک عالم کا برہم کھا گیا
کان میں پھونکی ہیں اسکی جب وہ بات   آج تو سنتے ہی کچھ دم کھا گیا

میں ہوں کس گنتی میں از یک تا ہزار   گالیاں اُس کی تو عالم کھا گیا
تیغ سے اُس کی گئے گھائل بہت   زخم ایسے پر کوئی کم کھا گیا
مصحفی ایسا تھا کب زار و نزار
اوس کے تئیں پیارے تیرا غم کھا گیا

کام اپنا تو ہرگز نہ بتاں سے نکلا   کبھی نکلا بھی تو ہاں آہ و فغاں سے نکلا
تم تو کہتے تھے میاں دل ترا ہم پاس نہیں   سچ کہو کیوں جی بھلا اب یہ کہاں سے نکلا
یوں ہے برقع سے نمایاں جھلک اُس عارض کی   نور مہ پھوٹ کے جیسے کہ کتاں سے نکلا
دل میں کہتے تھے ملے یار تو کچھ اُس سے کہیں   مل گیا وہ تو نہ ایک حرف زباں سے نکلا
دوستاں مصحفی خستہ کی ٹک لیجو خبر
یہ دم سرد سا کیا اوس کے دہاں سے نکلا

جو دل اُس کے کوچہ سے آتا رہے گا   تو البتہ وہ تلملاتا رہے گا
پس از مرگ کیجو مری خاک تودہ   کوئی تیر اُس پر لگاتا رہے گا
لگاتار جاں پر جو ناخن اجل کا   ق   تو رشتہ رہے گا نہ ناتا رہے گا
نہ جاگیں گے خوابیدہ خاک عدم کے   اگر ایک عالم جگاتا رہے گا
گر اس فصل میں بچے گا دوانہ   تو ہر سال دھومیں مچاتا رہے گا
یہ شرط مروت ہے اے بے مروت   کہاں تک تو مجھ کو کڑھاتا رہے گا
جو ملنا ہے تجھ کو تو آ جلد مل لے   کہ پھر ہاتھ سے وقت جاتا رہے گا
نہ ہو مصحفی خصمی دل سے ایمن
رہے گا یہ جب تک ستاتا رہیگا

ناگہ چمن میں جب وہ گل اندام آگیا
گل کو شکست رنگ کا پیغام آگیا
اٹھا جو صبح خواب سے وہ مست پر خمار
خورشید کف کے بیچ لئے جام آگیا
کہتے تھا اہل جرم سے کس کو کروں میں قتل
اتنے میں اس کو یاد میرا نام آگیا
افسوس ہے کہ ہم تو رہے مست خواب صبح
اور آفتاب عمر لب بام آگیا
ہے جائے رحم حال پہ جہاں اس اسیر کے
جو گرتے ہی ہوا سے تہ دام آگیا
گو میرا تڑپ تڑپ کے دی حسرت میں اپنی جان
بارے ٹک ایک دل کو تو آرام آگیا
سمجھو خدا کے واسطے پیارے برا نہیں
دو دن اگر کسی کے کوئی کام آگیا
گر قطع کب گیا تیرے کوچہ سے مصحفی
گر صبح کو گیا تو میں پھر شام آگیا

دل تجھ کو دیا ہے میرے غمخوار بھی تھا
پاس اپنے تو اے شوخ ستمگار بھی تھا
دے داد میری [illegible]
گل حشر کے دن بھی میرا [illegible] بھی تھا
ہے رونقی سینہ میں اب کس کو دکھاؤں
داغوں سے بتاں کے کبھی گلزار بھی تھا
اب جس دل بیمار کی کھلتی نہیں آنکھیں
راتوں کو سرہانے میرے بیدار بھی تھا
دامن کو کیا خشک چمن خوب ہی شاباش
رونے کا حق اے دیدۂ خونبار بھی تھا
لے چٹکی میں دل کھینچ لیا سینہ سے اس نے
انصاف کرو تیر کا سوفار بھی تھا
بوسہ کے عوض تم تو لگے گالیاں دینے
کل تم سے ہمارا میاں اقرار بھی تھا
ابرو نے تری دل ہی پہ تلوار چلائی
یعنی صف مژگاں میں نمودار بھی تھا
یوسف کو ترے حسن پہ دو دن کیونکہ بڑائی
اس کے بھی تو خال و خط رخسار بھی تھا
اس کو بھی جو دیکھا مجھے شب اس نے تو بولا
لا دو اسے کل بھی یہیں دیدار بھی تھا

بیزاری کے عالم میں کبھی آ گئے ہے بر سے   یا ناز سے تو کہتا ہمیں میرا یار بھی تھا
میرا دل بیداغ پسند اوس کی نہ آیا   ہر چند متاع سر بازار بھی تھا
دیکھی جو میری لاش تو کر اُس کو اشارہ   بولا کہ میری چشم کا بیمار بھی تھا
کیوں مصحفی خستہ کے تئیں تو نے کیا قتل
کیا سینکڑوں عاشق میں گناہ گار یہی تھا

گر اُس منہ سے برقع کبھی کھُل گیا   تو دیکھو گے مہر خاک میں رُل گیا
لب اُس کے [illegible]   نہ ہم سے یہ عقدہ اٹھے گو کھُل گیا
گیا جان سے ایک عالم میاں   ولیکن نہ تیرا تغافل گیا
رہا ہے کہاں ہم میں آرام صبر   وہ طاقت گئی وہ تحمل گیا
ہمیں دے گیا داغ جاتے ہوئے   غرض اس گلستاں سے جو گل گیا
وہی رنگ گل ہے وہی چہچہے   چمن سے کہاں شور بلبل گیا
لگی چوٹ دل کو مرے وا تیغ سے   سحر نالہ کرتا جو بسمل گیا
میں کہتا تھا عاشق نہ ہو مصحفی
تو ایسی ہی باتوں میں تو گھُل گیا

اب تو ہر کوچہ میں اس کے شور و شر رہنے لگے   روز ایک بیچارہ وہاں آ کر بسر رہنے لگا
یاد آئے آئینہ دیکھتے شرماتے تھے تم   یاد وہ اب تصویر سا پیش نظر رہنے لگا
یہ صباحت یہ لطافت یہ نزاکت تیرے ہائے   آئنہ ہو یک کے کھڑا تو پیش در رہنے لگا
اس قدر پرچا کہ گھر خوش ہی نہیں آتا ہے   دل اُسی کوچہ میں اب آٹھوں پہر رہنے لگا
پہلے در سے جھانکنے کی یاں اُسے رخصت نہ تھی   یاں مرا اُس کا اب سر دیوار و در رہنے لگا

ہائے کیا سودا ہوا ان یاروں کو اس سرکشیں ساری ساری رات اب تو درد سر رہنے لگا
خشک ہو جینے کے قریب آیا تو تھا کشت داغ دل پھر نئے سر سے یہ پھولا ان دنوں تو ہرا رہنے لگا
چل بسے وہ یاں سے جو ہمدم تھے ہم بھی ہیں اب آشنا رات دن تو جا بجا کے تو پھرو ہے بے گھر رہنے لگا
یا تو ہم نام سفر سے بھاگتے تھے لاکھ کوس یا پھر اب ہی سے ہر گھڑی عزم سفر رہنے لگا
آگئی کیا جانئے کس بات سے اس پہ شکست اب جو بیدل اس قدر آزردہ تر رہنے لگا
مصحفی کو آگے یارو دل لگی کی بات تھی عشق
اب تو کچھ درد جگر سے بے خبر رہنے لگا

کیا جانے کیا کرے گا یہ دیدار دیکھتا ایک دن میں آئینہ اسے سو بار دیکھتا
کیسی ہے اس کی ابروئے خمدار دیکھتا لیتی ہے مول اس کی یہ تلوار دیکھتا
تمہاری جا بجا صفت اس کی یار سے کیا ناز ہے یہ دل بھی جگر دار دیکھتا
یاں جس کو ہے یہ عشق سے آفت لگی ہوئی ظالم کوئی نہ ہو یہ طرح دار دیکھتا
کھنچتے ہیں اپنی طرف زلف وہ تار قطع کتنے ہیں ایک دل کے خریدار دیکھتا
عالم کو ایک نگہ میں کیا تو نے قتل عام ظالم تک اس طرف بھی تو اک بار دیکھتا
شائق ہیں اس کے جان و دل دیدہ سب بہم کس کس کے چاہتے وہ دو چار دیکھتا
کچھ پھیر تو الگ چلی ہے صبا اس کی زلف سے ہے شام ہجر اس بلا میں گرفتار دیکھتا
گر زلف و خط یہی ہے تو اک دن تو میری جاں عالم کو اس بلا میں گرفتار دیکھتا
خواہش میں آب خواہ ہوں آئینہ ہر طرح مشتاق رہے مجھے ترا دیدار دیکھتا
چھپتا کہیں ہیں سر پہ تو بھی جو یک کج کلہ خوباں کج کلاہ کی دستار دیکھتا
جب دیکھا ہم نے اس کو تو مر گئے ہم تپ سے لیتی ہمیں نہیں ہے [illegible] دیکھتا

جاتی ہے اُن کے ساتھ چلی جان عاشقاں
ان خوش قدوں کی خوبی رفتار دیکھنا
بہر خدا تم اُس بت آشفتہ وضع کی قطعہ
ٹک ڈھیلے پیچ ولٹ پٹی دستار دیکھنا
اے مصحفی میں تجھ سے کہوں طرفہ ماجرا
سنتا ہے اس طرف کو ٹک اے یار دیکھنا
لیکن بشرط آنکھ تجھے ہے بسر کی قسم
کیجو کسی سے اُس کو نہ اظہار دیکھنا
کچھ اندنوں میں آگے کی نسبت تیرا رفیق
بے طرح ہو چلا ہے بد اطوار دیکھنا
باور نہیں ہے تجھ کو اگر یہ میرا سخن
تو آپ جاکے تو یہ شب تار دیکھنا
دیوار و در پہ اُس کی ٹک ایک رکھ کے گوش و چشم
سنتا یہ حرف اور بھی اسرار دیکھنا
چھیڑے ہے اُس کو غیر تو کہتا ہے اُس سے یوں
کوئی کھڑا نہ ہو پس دیوار دیکھتا
پس اسطرح سے یکدگر اُس شمع رو کے تئیں
ہے ہر کسی سے گرمی بازار دیکھتا
اپنی طرف سے ہم تو میاں تجھ کو کہہ چکے
ٹک تو بھی اپنے دل میں تو ایکبار دیکھنا
یہ بات ہے مناسب غیرت کہ روز و شب
اُس کو نشستہ در بر اغیار دیکھنا
یا تو تو اپنے دام میں لا اُس کو صبح و شام
یا جا کے اور کوئی طرحدار دیکھنا

ٹک دیکھتا تو جا تیرا بسمل کدھر چلا
کر ذبح اُس کو ہائے تو قاتل کدھر چلا
شرمندہ ناصبوری بھلا کیسے عشق میں
تنہا تو مجھ کو چھوڑ کے اے دل کدھر چلا
مانند گرد باد ہے پیچھے رو بہ آسماں
آوارگاں شوق کا محمل کدھر چلا
آنکھوں سے بحر اشک کا بہنے لگے ہے موجزن
ہم تجھ سے تب کہیں گے کہ ساحل کدھر چلا
دل تک پہنچ کے تو نے کیا سوئے کعبہ رو
اے مصحفی تو چھوڑ کے منزل کدھر چلا

صحبت میں غیر کی نہ مرے یار بیٹھنا　　بیٹھے بھی گاہے جاکے تو ہوشیار بیٹھنا
بیطرح اختلاط نکالا ہے تم نے واہ　　آتے ہی پاس چپٹ سے وہیں مار بیٹھنا
اٹھ جاویں گر تم ایسے ہی ہوتے ہو بد دماغ　　لازم ہے تم کو ہم سے ہو بیزار بیٹھنا
ہو جاوینگے اک آن میں رستے کے رستے بند　　جاکر کہیں نہ تو سر بازار بیٹھنا
وقتیکہ در کے آگے سے اُن نے اٹھا دیا　　کیا فائدہ نہ لا پس دیوار بیٹھنا
خواہی بر آب خواہ بر آتش ہمیں میاں　　جس جا کہ تو بٹھاوے گا ناچار بیٹھنا
بیٹھوں میں کیونکہ چین سے یاروں کراں دنوں　　خاطر سے لے گئی ہے وہ رفتار بیٹھنا
ہوں گرچہ بے گناہ پہ مجھے تیرے روبرو　　سر کو جھکائے مثل گنہگار بیٹھنا
کیا یہ بھی چھیڑ نکالی ہے یوں میرے سامنے　　آئینہ لیکے ہاتھ میں ہر بار بیٹھنا

اے مصحفی وہ دوست ہی دشمن ہے جان کا
تو اُس کے پاس جاکے نہ زنہار بیٹھنا

رونے سے سوز داغ جگر دور ہو گیا　　اس خوں میں اشک مرہم کافور ہو گیا
کیا جانے ماہ تھا کہ کوئی آفتاب تھا　　سارا گھر اُس کے آتے ہی پُرنور ہو گیا
اب دور تک اُس کے لئے اپنی رسائی ہو کسطرح　　سب کو جو داد خواہی سے معمور ہو گیا
آتے ہی اُس نے مکھڑے پہ زلفیں جو کھولدیں　　روز وصال بھی شب دیجور ہو گیا
شبنم کو کیا میں روؤں کہ اس گلستاں کے بیچ　　جو گل کھلا سو کھلتے ہی کافور ہو گیا
واں اُس کی چشم سے نہ بہا ایک قطرہ آب　　یہاں سینہ داغ عشق سے ناسور ہو گیا
تھا شب کی بیکسی کا مجھے تا سحر دماغ　　دیکھا آنکھیں اس کی اور بھی مخمور ہو گیا
تو بھی فرو نہ ہوئی ترش روئی شیخ کی　　بھڑوا اگرچہ سوکھ کے انگور ہو گیا

اے مصحفی چھپائے ہے کیا اب تو عشق کو
یہ قصہ ایک جہان میں مشہور ہو گیا

پاس رقیباں سے زبس دور ہو گیا　　فریاد کرتے کرتے میں رنجور ہو گیا
جب آئینہ سے اس نے منہ اپنا پھرا لیا　　آئینہ جیسے دیدۂ بے نور ہو گیا
پیران مو سپید سے گرمی نہ ڈھونڈھیے　　یعنی ہوا جو پیر سو کافور ہو گیا
خوش قسمتی تو دیکھ کہ سینے کے داغ پر　　رکھا جو میں نے مشک تو کافور ہو گیا
اول تو تھا ہی اس کے تئیں ایک غرور حسن　　دیکھا آئینہ تو وہ بھی مغرور ہو گیا
ساقی خبر لے جلد کہ کل آئینہ میں شوخ　　آنکھوں کو اپنی دیکھ کے مخمور ہو گیا
تجھ کو بھی کتنا دعوی طاقت تھا مصحفی
بس تو تو ایک ہی زخم میں سب چور ہو گیا

دل و دماغ تھا کب ہم کو ایسی ذلت کا　　خدا کرے کہ برا ہووے اس محبت کا
نہ بوسہ لینے کی کر مجھ پہ او میاں تہمت　　نہ ہوگا اور کوئی شخص میری صورت کا
شب وصال گزر ہی گئی ایک آہ بیچ　　پھر آیا دکھ مجھے دینے کو روز فرقت کا
جفائے یار سے گھر ہی سو دل ہی پہ گزری　　زباں پہ حرف نہ آیا کبھو شکایت کا
نہ آفتاب چھپے ہے نہ شام ہوتی ہے　　یہ روز ہجر ہے یا رب کہ دن قیامت کا
میرے جنوں پہ نپٹ تنگ ہے فضائے جہاں　　مکان چاہیے اس کو بڑی فراغت کا
نہ دلبری نہ ترحم نہ لطف نہ اشفاق　　ہو آشنا کوئی کیا ایسے بے مروت کا
نہیں ہے اور کوئی اب تو آ گلے سے لگ　　ملے گا پھر نہ کبھی ایسا وقت فرصت کا
نجان اس کو تو اور عاشقوں میں سا ہرجائی　　ہے مصحفی تو گرویدہ ایک تیری الفت کا

مرا زخم جگر کاری ہے اس مرہم سے کیا ہوگا
موا اب میں تو رو رو مت کوئی ماتم سے کیا ہوگا
اس اشک و آہ سے گر دل نہیں لگتا تو گلشن میں
نسیم بوئے گل اور قطرۂ شبنم سے کیا ہوگا
رہا ہے کون عالم میں سدا عالم یہ فانی ہے
گر اٹھ جاوینگے ہم بھی ایک دن عالم سے کیا ہوگا
یہی تو روتے روتے جی ہمارا ڈوب جاویگا
اگر چپ کر نہ ہوگے میاں تم ہم سے کیا ہوگا
ہمیں تو آگے ہی اپنا حوصلہ معلوم ہے سچ ہے
بجز از نالہ و فریاد و زاری ہم سے کیا ہوگا
ڈبویا خانماں مردم کا ان آنسوں کے ریلے نے
خدا جانے اب آگے دیدۂ پرنم سے کیا ہوگا
تیرا بیمار بچنے کا نہیں اتنا سمجھ لینا
کوئی دم اس میں گر آتا ہے تو اس دم سے کیا ہوگا
دم مرحوم پہ اب صبر کرنا ہی مناسب ہے
نہ ڈاڑھیں مار رو اے مصحفیؔ اس غم سے کیا ہوگا

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
میرے پہلو میں رات جا کر وہ
ماہ تھا یا ہلال تھا کیا تھا
چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم
حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا
شب جو دل دو دو ہاتھ اچھلتا تھا
وجد تھا یا وہ حال تھا کیا تھا
جس کو ہم روز ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا
مصحفیؔ شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

میں نے کس چشم کے افسانے کو آغاز کیا
جس کو سنتے ہی میرے خواب نے پرواز کیا
شب وصل ایسے سر ڈھونڈھے کوئی کیونکر وا شد
جس نے سوتا تجھے یک بند قبا باز کیا
بیل سن انداز کے صدقے کر جو کی مجھ پہ نظر
دیکھتے ہی مجھے ان نے نظر انداز کیا

گر کرے ناز تو اس حسن پہ اپنے ہے بجا کہ خدا نے بھی بنا تجھ کو بہت ناز کیا

مصحفی آفریں اس تیرے لب و لہجہ پر
کہ فصاحت نے ترے مُنہ کو شیراز کیا

ملنے کا اُسکے جب کبھی ہم نے ڈھب کیا سو ناتوانیوں نے ہمیں جاں بلب کیا
کب وقت بوسہ آگے وہ دیتا تھا گالیاں ہم نے ہی منہ لگا کے اُسے بے ادب کیا
ہوں بسکہ صرف یاد میں اُسکی ان دنوں جو کچھ پڑھا تھا میں نے فراموش سب کیا
ضبط عطش پہ کیجیو نظر اُس مریض کے مرتے بھی وقت جس نے نہ پانی طلب کیا
پیمان شکن ہم اتنے تو آگے نہ تھے میاں جھوٹھوں میں لیک نام کو مشہور اب کیا
دن عہد کر گئے تو نہ پھر رات کو ملے آئے نہ دن کو چل کے اگر وعدہ شب کیا

اے مصحفی وہ دم میں نہیں اپنا آشنا
تو نے جو اُس کو راہ میں ٹوکا غضب کیا

گو زخمی ہیں ہم پہ اُسے کیا غم ہے ہمارا اب تک بھی نہ پہنچی ہے نہ مرہم ہے ہمارا
ہوں شمع سراپا میں نہ بس یا تن گریہ جو بال ہے مژگاں کی طرح نم ہے ہمارا
ٹک دیدۂ انصاف سے دیکھو تو عزیزو معشوق بھلا اوروں سے کیا کم ہے ہمارا
دل جبر ہا گئے تیر اپنے سوا اپنا نہیں کوئی یوں یار اگر پوچھو تو عالم ہے ہمارا
روتے ہیں کھڑے لاش پہ سینہ پیٹنے والے یعنی کہ ترے کوچہ میں ماتم ہے ہمارا
اُٹھ جائیں گے رہنے کے نہیں کوچۂ بتاں میں عزم سفر اب یہاں سے مصمم ہے ہمارا

اے مصحفی اب کوچہ میں اُس ماہ جبین کے
نہیں اور تو کوئی مگر ایک دم ہے ہمارا

ہر بات کے کہنے میں جو یاں مکمن ہے ہمارا   ہم جانے ہیں یہ دل نہیں دشمن ہے ہمارا
پوشیدہ نہیں شمع صفت سوز دل زار   احوال غرض آپ پہ روشن ہے ہمارا
کیا جامۂ صد چاک کا ناصح تو سئے گا   ثابت نہ تو چولی ہے نہ دامن ہے ہمارا
زلف و خط و کاکل نے چھپایا نہیں دل کو   وہ اور ہی ہے جس کے اوپر ظن ہے ہمارا
افسانۂ محبت کے کوئی سیکھ لے ہم سے   کہتے ہیں جسے عشق سو وہ فن ہے ہمارا
تکلیف نہ دے ہم کو تو گلگشت چمن کی   خود سینہ ترے داغوں سے گلشن ہے ہمارا
پھرتا ہوا آ جائے جو ایدھر سے تو ملتا
اے مصحفی اس کوچہ میں مسکن ہے ہمارا

تجھ سے گر وہ ملا نہیں ملتا   تو بھی تجھ کو کیا نہیں ملتا
جس کو وہ زلف مار ڈالے   مردہ تمن بہا نہیں ملتا
اور سب کچھ ملے ہے دنیا میں   لیکن ایک آشنا نہیں ملتا
دل دیوانہ دو دن سے گم ہے   کہیں اس کا پتا نہیں ملتا
شیخ کعبہ سے اٹھ نکل باہر   گھر میں بیٹھے خدا نہیں ملتا
درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط   یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا
اک نے پوچھا کہ مصحفی سے بھلا تو   کیوں تو اس سے جا نہیں ملتا
ہنس کے بولا کہ او میاں اس سے
کیا کروں دل مرا نہیں ملتا

یوں تو دنیا میں کیا نہیں ملتا   پر دل با صفا نہیں ملتا
کشتۂ خنجر تغافل کو   جز نگاہ خوں بہا نہیں ملتا

بت پرستی سے باز آ اے دل　　بت کے پوجے خدا نہیں ملتا
دیکھے بت خانے سینکڑوں کوئی　　بت کافر ادا نہیں ملتا
جان بر تا مجھے غنیمت ہے　　عاشق باوفا نہیں ملتا
جب سے میں پہ قدم رکھے ہے وہ شوخ　　خاک میں دل میرا نہیں ملتا
میں جو اس سے کہا تو مجھ سے میاں ن　　شب کے دن میں گیا نہیں ملتا
ہم کو دیکھا وہ یوں لگا کہنے　　کیا کرے گا ملے جا نہیں ملتا
بن تمہارے چھڑکے نمک زخم سینہ پر
مصحفی کچھ مزا نہیں ملتا

ناگہ چمن میں جب وہ گل اندام آگیا　　گل کو شکست رنگ کا پیغام آگیا
سوچا تھا اہل جرم سے کس کو دوں میں قتل　　سنتے ہیں اس کو یاد میرا نام آگیا
افسوس ہے کہ ہم تو رہے محو خواب صبح　　اور آفتاب عمر لب بام آگیا
ہے جائے رحم حال پہ میاں اس اسیر کے　　جو گرتے ہی اداسے تہ دام آگیا

ان آنکھوں سے آب کچھ نہ نکلا　　بغیر از خونناب کچھ نہ نکلا

کنج قفس میں جو کوئی مر گیا　　ظالم بیاں دگر کر گیا
قصہ کہوں کیا دل بیمار کا　　عشق کی تپ تھی نہ بچا مر گیا

نظر آتا ہے یہ تندرا سیکھے ہر جاتی سا　　دیکھ ہم سے ہر کوئی ہو جاتا ہے سودائی سا

مصحفی تھا نہ شیعہ مذہب لیک   نعرۂ بوتراب کس دن تھا

میاں تم ہم سے تب کرتے ہو رم کیا   نہیں ایسے بُرے لگتے ہیں ہم کیا
ستم کرتے رہے تم اور ہم نے   نہ جانا یہ کہ ہوتا ہے ستم کیا
قسم کھاتے ہو میرے سر کی جھوٹی   میاں جاؤ میں جھوٹوں کی قسم کیا

چلی ہی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم   کہیں تو قافلۂ یاد بہار ٹھیرے گا
جو سیر کرتی ہے کر لے کہ جب خزاں آئی   نہ گُل رہے گا چمن میں نہ خار ٹھیرے گا

غیرت پہ باغباں کی پتھر پڑیں کہ ہم نے   سو بار گُل کو ہنستے باد صبا سے دیکھا

ملیں اس کی صف مژگاں ہلانے ہی کھاتی ہے   چڑھ آتا ہے عاشق پہ گویا کردکن سالا

یہ خستہ تمام ہو چکا اب   بس اپنا تو کام ہو چکا اب
سب ناظم ملک سو رہے ہائے   دُنیا کا نظام ہو چکا اب
قاصد اگر اس گلی میں جائے   کہیو کہ غلام ہو چکا اب
دُنیا ہے سرائے فانی اس سے   چلیے کہ مقام ہو چکا اب

رہا پر دل تو بیمار محبت   گیا اس سے نہ آزار محبت

ہیں عاشق اور بھی لیکن نہ ہوگا   کوئی مجھ سا گنہ گار محبت
نہ دیکھا جس نے رشتہ دانہ دام   سو میں ہوں وہ گرفتار محبت
اُسے کیا دوش رسوا ہو گیا ہوں   میں آپ ہی کر کے اظہار محبت

عشق بتاں میں کس سے کہوں کیا کیا ہوں   تمیں رہے تیں خدا کو پر شکلیں دکھانیاں
گر ابر گھرا ہوا کھڑا ہے   آنسو بھی تلا ہوا کھڑا ہے
حیران ہے کس کا جو سمندر   مدت سے رُکا ہوا کھڑا ہے
ہے موسم گل چمن میں ہر نخل   پھولوں سے لدا ہوا کھڑا ہے
شمشاد برابر اُس کے قد کے   دہشت سے بچا ہوا کھڑا ہے

رنج غربت میں بھی آرام بہت سا پایا   دربدر گو کہ پھرے نام بہت سا پایا
درد دل سے مجھے ایکدم کبھی تسکین نہ ملی   گم ہوا صبح تو پھر شام بہت سا پایا
ہے گردش میں رہی جبتک تھے پیمانے میں ہم   چین آتے ہی تہ دام بہت سا پایا

ہرگز مریض حضرت عیسیٰ نہیں بچا   عیسیٰ نے جسکی کی ہے مداوا نہیں بچا

ہمیشہ شعر کا کہنا کام تھا ناخواندوں کا   سفیہوں نے دیا دخل اسمیں جب سے بس فن بگڑا

کیوں نہ دل نظارگی کا جائے لوٹ   لکھنؤ میں حسن کی بندھتی ہے پوٹ

اور تو ثانی نہیں اُس کا کوئی   مصحفیؔ کا ہے قتیلؔ البتہ جوڑ

ہزاراں حیف تب سے ہو گیا ہے سوکھ کر کانٹا   پڑی تھی آنکھ اُس کی جب سے اُس نازک کے جوبن پر
سڑی ہے آسیا تاب سُرخی مسی کی دھڑی جس نے   کمر باندھی ہے خونریزی کی خاطر برگ سوسن پر
خرام ناز میں اُس کے وہ پس کر ہو گیا سرمہ   پڑا اُس بیچ جو اُسکا دامن برگ سوسن پر

پرسش شعر و سخن تو نہ ہی تند جواب   ہاں مگر بولنے لگے جو چند آخر کار

غیروں کو پان دیتے ہو ہر وقت تم لگا   اک روز خون ہوگا اسی برگ پان پر
باتیں چبا چبا نہ کرو تم چبا کے پان   سُرخی لبوں کی لائے گی آفت وہاں پر
شاد تھے جب تک عناصر کا نہ تھا دام قفس   یہاں ہوئے ہم کس خرابی میں گرفتار آن کر

پہنچا قریب مرگ تو میں تجھ کو چاہ کر   تو ابتدائے عشق پہ میرے نگاہ کر
اے دل شب فراق یہ آئی ہے سو نہ رہ   میں نالہ سر کروں تو میرے ساتھ آہ کر
رہتے ہیں ساکنان قفس منتظر ترے   باد صبا ادھر بھی گزر گاہ گاہ کر

دیکھا ہے اُس کا سبزۂ خط خواب میں مگر   مُنہ ڈالتے نہیں ہیں جو آہو گیاہ پر

دیتی تھی ہم کو نکہت گل کا پتا نسیم   ہم سے بھی تھی چمن میں کبھی آشنا نسیم

اٹکھیلیاں جو کرتی ہیں کلیوں سے دم بدم
تجھ کو بھی کیا لگی ہے چمن کی ہوا نسیم

اے شور حشر پاس ہمارے نہ آئیو
کچا ہے نیند میں ابھی خواب گراں میں ہم

بسمل نے وقت ذبح گر آنکھیں کھولیاں
رخصت وہ تیرے خنجر مژگاں سے ہو لیاں
عاشق پہ برچھیاں تیری مژگاں سے کھولیاں
یہ کشتنی نہیں وہ نگاہیں نہ بولیاں
ازبسکہ ہو گئے ہیں نپٹ شوخ طفل اشک
باہر نکل کے گھر سے یہ کھیلیں ہیں گولیاں
محتاج عطر کب ہے وہ پیراہن بتاں
جوش عرق سے جن کی مہکتی ہیں چولیاں
پھبتی و جگت وہی سے میرے ساتھ شوخ کی
ویسی ہی شستہ شستہ وہی ہیں ٹھٹھولیاں
محروم برگ گل سے نہ رکھ اب تو باغباں
گلچیں سے گل اٹھاتے ہیں بھر بھر کے جھولیاں
سودا نہ مصحفی سے گیا گو طبیب نے
جلاب بھی دیئے کئی فصدیں بھی کھولیاں
نرگس نے گل کی دید کو آنکھیں جو کھولیاں
کچھ جی میں جو سمجھ گئیں کلیاں نہ بولیاں
کیا تیس کو وہ مجھ سے آیا سوئے بیٹھے
لڑکے بھرے پھرے ہیں جو پتھروں سے جھولیاں
آنسو نہیں یہ عشق سے جو مجھ کو تنگ ہے
سارے تن سے دونوں چشم کے ڈھلتی ہیں گولیاں
دشمن نے حیلہ جوئی کمانت مسیح کو
آخر نہ پٹیاں مری زخموں کی کھولیاں
سج دھج ادا فصاحت و تقریر کیا کہوں
دیکھا تو لکھنؤ کی زبا منت ہیں بولیاں
خوباں بسنت رنگ کی پھبن میں کیا ہو قدر
جب دور دور بیچے بکتی ہیں پانوں کی ڈھولیاں
نو چندی پنجشنبہ ہے چل تو بھی مصحفی
جاتی ہیں کربلا کو حسینوں کی ڈولیاں

اُس نے لٹیں جو جعدِ معنبر کی کھولیاں خدمت کو ناگنیں پھر گئیں ساتھ ہولیاں
شاید کہ شہرِ عشق کی بگڑی ہے پھر ہوا ہر کوچہ دیکھتا ہوں مریضوں کی ٹولیاں
کافی ہے ہم کو یک گلِ نشگفتہ اے نسیم گلچیں گلوں سے گو کہ بھریں اپنی جھولیاں

کیوں تڑپتے تم سے بسمل ہیں یہ مر جائیں کہیں سر دمِ تیغ تلے رکھ کے گزر جائیں کہیں
زیرِ دیوارِ چمن ذبح مجھے کر صیاد شاید اُڑتے ہوئے یہاں سے پر جائیں کہیں

کسی سے ہم نے جو آنکھیں ملائیاں ہوتیں تو یار دیکھتے پھر کیا لڑائیاں ہوتیں

ترا گیسو جو دیکھا مجھ پہ کیا کیا آفتیں چڑھیاں بٹیروں کی طرح دیتا رہا ہوں کہیں پڑیاں

ہم تو چمکتے ہی ہوا ہو گئے مثلِ شررِ دم میں فنا ہو گئے
مجلسِ ہستی میں جو آتے تھے یار یہ نہیں معلوم وہ کیا ہو گئے
رشک ہے اوقات پہ اُنکے مجھے موسمِ گل میں جو رہا ہو گئے
سیرِ چمن کی نہ وہ ہم کو یاد وہ بھی دن اے بادِ صبا ہو گئے

رانجھا کے تصور سے بھی سوتی نہ پلٹ کر تو نے ہوسِ دل نہ کچھ اے ہیر نکالی
تھی گرفتاری میں بھی اک لذتِ آسودگی کیا کہیں ہم کتنے پچھتائے نکل کر دام سے

وصل میں جیوں جیوں مزا پاتا ہے جی
ساتھ پانوں کے چلا جاتا ہے جی
کون مجھ سے دُک بہلا ہے ان دنوں
بیٹھے بیٹھے کبھوں رُکا جاتا ہے جی
جی اگر جاتا ہے کسی کا بے گنا
آپ کا کچھ ہے کہ کیا جاتا ہے جی
ہجر کے غم کو کہاں تک جھیلئے
آہ اپنا تو کھپا جاتا ہے جی
دیکھ اس کی چال کا تب آئے ہے
سنتے صاحب کا رہا جاتا ہے جی

نہ بھیجے لائی گلِ ارمغاں کبھی افسوس
ہمیں قفس میں نسیمِ بہار بھول گئی

کو نقش مرا بنا گیا ہے دل پہ حسرت دلی میں ہم
چار چشم اک آن ہو کے تجھ سے گئے یہاں سے
عمر بھر جب عشق در چشم میں رکھا ہو قدم
مصحفی کیا ہم سکے پھر تا جہان دید کر

خاموش ہیں ادب سے وہ طوطوں بیچ آگئے
دعوی نہیں کرتا کوئی موندوں بیچ آگئے
واقف ہے یہ گفتگو ایسی جو کرتا ہے نشست
واللہ کہ وہ شخص ہے جھگڑوں بیچ آگئے
لاتا نہیں خیال میں شفاعت بیہدہ گو کا
اعجاز مسیحا بھی ہے افسوں بیچ آگئے
دشمن سب ہے دنیہ کو بہیمر کے پہنچا
ہے موسی عمران بھی ہاروں بیچ آگئے
باندھے ہوئے ہاتھوں کو با صلح جابت
ہاتھ ہیں کھڑے سینکڑوں پیغمبر آگئے
جب عرش پہ آجاتے ہے دنیا طبیعت
قطرے سے بھی کم پھیرے ہے جیحوں بیچ آگئے
یہ شیخی پہ آویں تو ابھی اہل صفا سے
ہو جاویں سبب سب پہ مسکینوں بیچ آگئے
استاد ہوں میں مصحفی حکمت کے بھی فن میں
ہے کودک نو دیں تلاطوں بیچ آگئے

ہے جام طرب ساغر پر خوں مرے آگے   ساقی تو پلا بادۂ گلگوں مرے آگے
ہا ٹک لب کے ہلا دینے میں جہّال عجم کا   ہو جائے ہے احوال دگرگوں مرے آگے
سمجھوں ہوں اسے مہرۂ بازیچۂ طفلاں   کس کام کا ہے گنبد گردوں مرے آگے
جب تیشے پہ آتا ہے مرا توسن خامہ   بن جاویں ہیں تب کوہ بھی ہامون مرے آگے
میں گو نہ سمجھتا ہوں سوا اس کی صدا کو   گو لیل اُٹھے آدھی کے چون چپں مرے آگے
قدرت ہے خدا کی کہ ہوئے آج دو شاعر   طفلی میں جو کل کرتے تھے غاں غوں مرے آگے
سب خوشہ ربا ہیں مرے خرمن کے جہاں میں   کیا شعر پڑھے گا کوئی موزوں مرے آگے

موسیٰ کا عصا مصحفی ہے خامہ مرا بھی
گو خصم بنے اسود افیوں مرے آگے

آنکھوں کو اس کی دیکھ کے بیمار ہم ہوئے   زلفوں سے اک بلا میں گرفتار ہم ہوئے
جب فصل گل قفس میں گرفتار ہم ہوئے   یہ جی میں تھا کہ زیست سے بیزار ہم ہوئے
تو عزت رقیب کا خواہاں رہا سدا   ظالم تری بلا سے اگر خوار ہم ہوئے
سر بار تھا ہوا نہ تہ تیغ اجل کیا   اب کی سفر میں خوب سبک بار ہم ہوئے

ہوں شیخ مصحفی کا میں حیران شاعری   اللہ مفلسی میں یہ کچھ شان شاعری
ہر چند اسے تمام مرے بخش کلک نے   سودا سے بچ رہا تھا جو میدان شاعری
میں اور لے کے سودہ نمک اس میں بھر دیا   تھا اس کا کم نمک جو نمکدان شاعری
ہندوستان کی گردن خرد و بزرگ پر   ہے سچ تو یہ بڑا ہی ہے احسان شاعری
پیرو ہیں میرے طرز کے یہاں جو شاعر بڑے   ملک سخن کا ہوں میں سلیمان شاعری

بہتیں ہیں اپنا آفتی ہیں اب سخن کے اہدیار　　تھا ہاتھ پر میرے جو گریبان شاعری
دکھلانے ہے نوک خامہ جادو رقم ہنوز　　مژگاں نہ ہے تازہ گلستان شاعری
مندی جو آنکھیں میں نے تو چشم زمانہ سے　　چھپ جاویگا وہ نہیں مہر تابان شاعری
ہیں مبتلائے عمر میں دشت تلک　　چھانا ہے فارسی کا صفاہان شاعری
بعد اس کے ریختہ کی بھی رکھی ہے وہ بنا　　حیران ہیں جس کے نقش طرازان شاعری
کچھ کچھ کہے ہیں پھر عربی میں بھی شعر تو　　اس میں بھی بن گیا ہوں میں سحبان شاعری
دن رات میرے ناخن نوک قلم میں ہیں　　لاکھوں طریق وشیوہ وعنوان شاعری
ہر سفلہ کا دہن یہ نہیں ہے کہ کہہ سکے　　میرے سوائے شمع شبستان شاعری
جس روز میرے جسم سے نکلے گی میری جان　　یہ جانیو تو آج گئی جان شاعری

لاکھوں ترانہ سنج ہوئے جس سے ریزہ چیں
اے مصحفی تیرا ہی ہے وہ خوان شاعری

خورشید کو سایہ میں نہ زلفوں کے چھپا رکھا　　چتون کی دکھا خوبی سرمہ کو لگا رکھا
سمجھا تھا پسٹ کر میں اُس ستمگر سیمبر نے　　پہلو سے میرے پہلو تا صبح جدا رکھا
معمار نے قدرت کے طاق خم ابرو کو　　موقع سے بنایا تو کنگرے کے جھکا رکھا
کس منہ سے اجل کو اب منہ اپنا دکھاویگے　　ہم ہیں کہ جی الفت نے کہ تو ہی کو کیا رکھا
قاصد جو گیا میرا لے نامہ تو اُس نے　　نامہ کے کئے پرزے قاصد کو بٹھا رکھا
بے یار عبث اپنے جیتا تو رہا میں پر　　رکنے نے میرے جی کے دم میرا خفا رکھا
کس لب کے تبسم نے چھڑکا تھا نمک ان پر　　زخموں کے الم نے شب تا صبح مزا رکھا
کیا جانے کب کا تھا میرا یہ فلک دشمن　　جو اُس مہ تاباں کو نت مجھ سے جدا رکھا

میں اپنے ہنر کا ہی بندہ ہوں کہ کل میں نے
پہلو میں دل اپنے کو پیکاں سی بچا رکھا
دیکھہ اوس کی ادا یارو بس میں تو گیا مر ہی
جوں ہاتھ کو قاتل نے قبضہ پہ ذرا رکھا
اے مصحفی میں کس کی رفتار کا کشتہ تھا
ہر شعر میں میں نے جو انداز نیا رکھا

بدنامی کے ڈر سے سر مکتوب پہ اُس نے
نام اپنا تو کیا نام میرا بھی نہیں لکھا

قفس سے چھوڑ دے تو اب تو ہمکو اے صیاد
چمن میں کہتے ہیں پھر موسم بہار ہوا

بچا گر ناز سے تو اُس کو پھر انداز سے مارا
کوئی انداز سے مارا تو کوئی ناز سے مارا
کسی کو گرمی تقدیر سے اپنی لگا رکھا
کسی کو مونھ چھپا کر نرمی آواز سے مارا
ہمارا مرغ دل چھوڑا نہ آخر اُس شکاری نے
گہے شاہیں سے پھینکے اُس پہ گاہے باز سے مارا
غزل پڑھتے ہی میری یہ مغنی کی ہوئی حالت
کہ اُس نے ساز مارا سر سے اور سر ساز سے مارا
نکالی رسم تیغ و طشت دلّی میں جزاک اللہ
کہ مارا تو ہمیں تو نے پر ایک اعزاز سے مارا
نہ اوڑ سکتا مرغ دل تو چنگل شاہیں میں کیوں پھنستا
گیا یہ خستہ اپنی خوبی پرواز سے مارا
جہاں تک سازواری تھی لکھی دشمن کے طالع میں
ہمیں بدنام کر کے طالع ناساز نے مارا
ہزاروں بیگنہ اوس کے خون نے یاروں کو دکھلائے
جب اُس نے مصحفی کو اپنی تیغ ناز سے مارا

جس دم کہ وہ کمر میں رکھہ کر کٹار نکلا
جس راہگزر سے نکلا عالم کو مار نکلا

خاک سیہ میں ہم نے اپنے تئیں ملایا   تو بھی نہ تیرے دل کا ظالم غبار نکلا
آئی زبان جو اپنی جنبش میں نزع کے دم   تیرا ہی نام مونھ سے بے اختیار نکلا
کمبخت دل نے میرا ہرگز کہا نہ مانا   آخر گلی سے اُس کی ہو بیقرار نکلا

نالہ مُرغِ سحر دل میں اثر کر ہی گیا   سنتے ہی اوسکے ہیں نہ نیا سفر کر ہی گیا
جس کی جس طرح کٹی غمکدہ ہستی میں   عمر اپنی کی وہ اوقات بسر کر ہی گیا

عشق کے صدمے اٹھائے تھے بہت پر کیا کہیں   اُبتو اِن صدموں سے کچھ جی اپنا گھبرانے لگا
دیکھتے ہی اوس کے کچھ اوس کی یہ حالت ہو گئی   جو مجھے سمجھائے تھا میں اسکو سمجھانے لگا

ایک عالم نے کیا ہے سفرِ ملکِ عدم   ہم بھی جاوینگے اگر سوئے عدم کیا ہوگا
ابھی آغاز محبت ہے کچھ اس کا انجام   تم کو معلوم ہے اے دیدہ نم کیا ہوگا

ہائے اوس کا ہمک کر رُوٹھ جانا   جیسے بجلی چمک کے اُٹھ جانا

کنجِ قفس میں لطف ملا جسکو وہ اسیر   چھوٹا بھی گر تو پھر نہ سوئے آشیاں گیا
تکلیف سیرِ باغ نہ کر ہم کو ہم صفیر   مدت ہوئی کہ دل سے وہ ذوقِ فغاں گیا
یارانِ رفتہ ہم سے مونھ اپنا چھپا گئے   معلوم بھی ہوا نہ کدھر کاروال گیا
باہم جنہوں میں مہر و مروت کی رسم تھی   وہ لوگ کب ہوئے وہ زمانہ کہاں گیا

اپنی تو اس چمن میں نت عمر یونہی گزری　　یہاں آشیاں بنایا وہاں آشیاں بنایا

مصحفی ریختہ پہنچا ہے میرا رتبہ کو　　شور یہاں گرد ہے مرزا کی میرزائی کا
فصل گل فصل خزاں دونوں گئیں آ آ کے　　مرغ دل کونسے موسم میں رہا ہوویگا

کھلا کھلا کر نہ ہنسا کیجئے آپ　　ایسی باتوں سے حیا کیجئے آپ
کوئی ہو کیوں نہ ہے تمہارا آشنا　　نہ مروت نہ وفا کیجئے آپ
کیوں میاں مصحفی جی بیٹھے ہو　　درد اپنے کی دوا کیجئے آپ

ہر چند اس نے میری طرف سے بنائی بات　　قاصد کو اس کے سامنے پر کہہ نہ آئی بات

ہائے وہ اوس کے میٹھے میٹھے ہات　　ہائے وہ اسکی گوری گوری گات
شربت وصل جس کو کہتے ہیں ،　　حق میں عاشق کے ہے وہ آبحیات
تو تو کیا جانے بیکسی پر میری　　شمع روتی ہے ساری ساری رات
ہے تجھی تک یہ اشک آہ اے شوق　　ساتھ دولہا کے جس طرح ہو برات
بسکہ اس قافلہ میں ہے شر و شور　　نہیں سنتا کوئی کسی کی بات
ہے اجل یوں کمیں میں انسان کے　　ہوش پر گریہ جوں لگائے گھات
قطب صاحب کی اب کے چھڑیوں میں　　اُمنڈ آئے ہیں جو بھی میوات
چھاتیاں دیکھ سادہ وضعوں کی　　دلی کے نوجوان ملے ہیں ہاتھ

پردگی ہے کوئی تو اس میں ہے ہے کھنچی یہ جو آسماں کی قنات
یہ تمام اہتمام ہیں اوس کے دن کہاں کا میاں کہاں کی رات
مجھ سے وہ ماہ خانگی نہ ملا گئے اب کے بھی یونہی بارہ وفات
مصحفی اپنی نا امیدی پر ہاتھ مل کر کہوں نہ کیوں ہیہات

دلّی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں ویران ہیں محلے سنسان گھر پڑے ہیں
دیکھا تو اس چمن میں باد خزاں کے ہاتھوں اکھڑے ہوئے زمیں سے کیا کیا شجر پڑے ہیں
بلبل کا باغباں سے اب کیا نشاں نہ پوچھو بیرون در چمن کے ایک مشت پر پڑے ہیں

عشق میں امتحاں ہزار دل ہیں خستہ و نیم جاں ہزاروں ہیں
آتشِ گل بھڑکیو نہ کچھ کسے ذرا باغ میں آشیاں ہزار دل ہیں
عشق کا قصہ ایک جا تمام نہیں اسکی تو داستاں ہزاروں ہیں

میں کیا کہوں کہ راتیں کیا سخت کٹتی ہیں اپنی تو چھاتیاں ان راتوں سی پھٹتی ہیں

تب غم سے جو چھاتیاں جلیاں حسرت میں آب ہو کے بہ چلیاں
نازک و نرم انگلیاں اس کی ایسی ہیں جیسے مونگ کی پھلیاں
کیوں کے دِلّی سے لکھنؤ ہے خوب نہ وہ کوچے ہیں یہاں نہ وہ گلیاں

اَب نت کی سہے تیری جفا کون   تجھ سا نہ میاں وفا کرے کون
سو بار گیا میں اوس کے در پہ   پُوچھا نہ کسی سے یہ بھی تھا کون
ہر چند سب آشنا ہیں لیکن   اس وقت میں اپنا آشنا کون

از بسکہ چشم تر نے بہاریں نکالیاں   مژگاں ہیں اشک سرخ سے پھولوں کی ڈالیاں
اے مصحفی تو اُن سے محبت نہ کیجو   ظالم غضب ہی ہوتی ہیں یہ دِلّی والیاں

اوروں کی دید بازیاں نظروں میں ٹالیاں   دیکھا جو ہم نے اوس کو تو آنکھیں نکالیاں

عجائب رسم ہے ہیہات اقلیم محبت کی   وہ اُلٹی دشمنی کرتا ہے ہم سے جسکو ہم چاہیں

ہے یہ عشق آفت و بلا تو نہیں   اس کا مارا کوئی جیا تو نہیں
دل کی تڑپنوں میں آن نکلے ہو   دیکھو کشتۂ ادا تو نہیں
پوچھتا کیا ہے حال دل کا میرے   او میاں تجھ سے کچھ چھپا تو نہیں
یعنی عاشق ہو اور ہرجائی   اب تلک ہم نے یہ سنا تو نہیں
بات پر اوس کی ہیں جو کل بولا   کہا کچھ ذکر آپ کا تو نہیں

خورشید اوج خوبی، ماہ سپہر احسان   شمشیر جنگ یعنی مرزا محمدی خان
برش میں تیغ جسکی ہے جیسے برق خاطف   بخشش میں ہاتھ جس کا ہے جیسے ابر نیسان

اوس کے جلوس سے ہے پالکی کی زینت   اس برجِ قوس کا ہے وہ آفتاب تاباں
کیا زرق و برق اوس کی پوشاک کا بتاؤں   ایک دن میں جا جو نکلا سوئے حریر دوزاں
زربفت مہر و ماہ کو مقراض کر رہے تھے   تا قطع کر سیئیں وے وصلی سنجاف داماں
کیونکر نہ ہر طرف سے تحسین بلند ہووے   ہو مصحفی سا شاعر جس بزم میں غزلخواں

مخلوق ہوں یا خالقِ مخلوق نما ہوں ،   معلوم نہیں مجھکو کہ میں کون ہوں کیا ہوں
ہوں شاہدِ تنزیہہ کے رخسار کا پردہ   یا خود میں ہی شاہد ہوں کہ پردہ میں چھپا ہوں
ہے مجھ سے گریباں گلِ صبح معطر   ہیں عطرِ نسیمِ چمن و بادِ صبا ہوں
گوش شنوا ہو تو میرے رمز کو سمجھے   حق یہ ہے کہ میں سازِ حقیقت کی نوا ہوں
ہستی کو مری ہستیٔ عالم نہ سمجھنا ،   ہوں ہست تو پر ہستیٔ عالم سے جدا ہوں
ہوں سلسلۂ عشاق میں سوزِ جگر و دل   اور دیدۂ معشوق میں میں ناز و ادا ہوں
یہ کیا ہے کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا ،   ہر چند کہ خود عقدہ و خود عقدہ کشا ہوں
اے مصحفی شاہیں ہیں مری جلوہ گری یاں   ہر رنگ میں میں مظہرِ آثار خدا ہوں

از بس کہ تیری ادائیں مجھکو کڑھاتیاں ہیں   جب دیکھتا ہوں تجھکو آنکھیں بھر آتیاں ہیں

کنجِ قفس میں دیکھ کے کہتی ہے مجھکو خلق   اس مرغ کو بھی حسرتِ پرواز ہے سنو

دل ہے لبریزِ تمنّا دیکھیو   مے سے چھلکے ہے یہ مینا دیکھیو

چشم و ابرو عالم تصویر ہے   اوس بت کافر کا نقشا دیکھیو
سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں تو کہے   ان خوش اندامیں کے اعضا دیکھیو

قصہ درد غریبی اوس سے پوچھا چاہیئے   موسم گل میں جو اپنے آشیاں سے دور ہو

یاس کو اوس بلبل بے پر کی دیکھا چاہیئے   آتش گل جس کے کچھ اک آشیاں سے دور ہو

گویا اسے خبر ہے کہ آئی بہار گل   ٹک اضطراب مرغ قفس زاد دیکھیو

کیا کھینچے ہے خود کو دور اللہ   اللہ رے تیرا غرور اللہ
حسن ایسا کہاں ہے مہر و مہ میں   کچھ اور ہی ہے نور اللہ
ہم نے تو بچشم خویش دیکھا   ہر شے میں ترا ظہور اللہ
ہیں ہم تیرے بندے میرے صاحب   گو شیخ کو دیوے حور اللہ
پہلو سے میرے نکل گیا بت   کیا مجھ سے ہوا قصور اللہ
جس دم میں کروں ہوں نالہ دل سے   اوٹھتا ہے کتنا شور اللہ
اے مصحفی حق نہیں سمجھتا   کہتا ہوں میں بے شعور اللہ

ہر چند بہار و باغ ہے یہ   ہر کس کو دل و دماغ ہے یہ
ہے بوند عرق کی زلف کے بیچ   یا گوہر شب چراغ ہے یہ

کیا لالہ کو نسبت اپنے دل سے   یعنی کہ تمام داغ ہے یہ
درگزرے ہم ایسی زندگی سے   دنیا میں اگر فراغ ہے یہ
پھر اپنی در رنگ کیا ہے ساقی   مے ہے یہ اور ایاغ ہے یہ
ایسا گیا مصحفی جہاں سے   یارو میرے دل پہ داغ ہے یہ
جو پھر نہ کہا کسو نے اتنا   اوس گمشدہ کا سراغ ہے یہ

کنج قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر   فصل بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

لب زخم سیئے ہی بنے   خون دل ہم کو اب پیئے ہی بنے
کھینچ کر تیغ یار آیا ہے   اس گھڑی سر جھکا دیئے ہی بنے
یار کا صبح پر ہے وعدہ وصل   ایک شب اور جیئے ہی بنے
اب تو اس درد دل کی تاب نہیں   مصحفی کچھ دوا کیئے ہی ۔ بنے

پردہ گر درمیاں سے اٹھ جائے   ایک جہاں چشم و جاں سے اٹھ جائے
مارے الفت کے مر گئے اے کاش   رسم الفت جہاں سے اٹھ جائے
اوس نے دیکھا مجھے تو یوں بولا   کہدو اس کو یہاں سے اٹھ جائے

اندک اے پیش روان نفعہ کہ اس منزل میں   ایک مسافر کوئی پیچھے ہی رہا جاتا ہے

اول تو قفس کا میرے در باز کہاں ہے   اور ہو بھی تو یہاں طاقت پرواز کہاں ہے

دل کو یہ اضطرار کیسا ہے   دیکھیو بے قرار کیسا ہے
ہر گھڑی گالیاں ہی دیتے ہو   جان میری یہ پیار کیسا ہے
اور تو ہیں ہما یہ کہو پیارے   مصحفی دوستدار کیسا ہے

چھوڑا نہ میاں مصحفی تم نے کوئی لونڈا   تم کام میں اپنے غرض اوستاد ہو کوئی

ہے ماہ کہ آفتاب کیا ہے   دیکھو تو نہ نقاب کیا ہے
مَیں نے تجھے تو نے مجکو دیکھا   اب مجھ سے تجھے حجاب کیا ہے
آئے ہو تو کوئی دم تو بیٹھو   اے قبلہ یہ اضطراب کیا ہے
اوس بن ہمیں جاگتے ہی گزری   جانا نہ یہ کہ خواب کیا ہے
مجکو بھی گنے وہ عاشقوں میں   اس بات کا سو حساب کیا ہے
سیپارہ دل کو دیکھ اوس نے   پوچھا بھی نہ یہ کتاب کیا ہے
اس میکدہ جہاں میں یارو   مجھ سا بھی کوئی خراب کیا ہے
قسمت میں ہمارے مصحفی ہائے   کیا جانئے ثواب عذاب کیا ہے

رباعیات

نہ شکوہ دور آسمانی کیجئے   نہ ذکر شہاں نہ پاسبانی کیجئے
اے مصحفی اب تو اس زمانہ کے بیچ   جس طرح سے ہووے زندگانی کیجئے

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے   ویرانے میں مجکو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت   اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

اے کاش نہ ہم ایسی محبت کرتے   اور کرتے تو کچھ تو صبر طاقت کرتے
گر ہے یہی بیکلی تو ایکدن یارب   مرجاوینگے یونہی عصمت عصمت کرتے

ہے حیف تو یہ کہ باجمال مثل حور   عصمت اور ہووے مائل فسق و فجور
یہ وہ ہے مثل کہ مصحفی کہتے ہیں   برعکس نہند نام زنگی کافور

کیا تجھ سے کہوں حال شہود عالم   کچھ ایک سی ہے بود و نبود عالم
بس تو ہی جو پوچھے تو مجھسے ناداں   جز عین وجود حق وجود عالم

عینیت ذات جسکو حاصل ہووے   عین دریا ہے گوکہ ساحل ہووے
کیا دخل ہے عکس رونما ہووے اگر   اللہ کے آئینہ مقابل ہووے

غزل سر دیوان سیوم

کیا دید میں عالم کی کروں جلوہ گری کا   یہاں عمر کا وقفہ ہے چراغ سحری کا
مردوں کو جلاتی ہے تیرے پانوں کی ٹھوکر   اس چال پہ مرنا ہے بجا کبک دری کا
تربت پہ میری برگ گل تازہ چڑھا ہے   احسان ہے مجھ پہ یہ نسیم سحری کا
جو دیکھے ہے نقشے کو ترے وہ یہ کہے ہے   سارا بدن انسان کا چہرہ ہے پری کا
واقف ہیں مرے حال سے کیا اہل شریعت   ویرانے میں کم ہوتا ہے گزر راہ گزری کا
کیا لطف مقام اون کو جو آمادۂ رہ ہیں   دل کوچ میں رہتا ہے ہمیشہ سفری کا
داغوں سے مرے بوئے اگر کیونکے نہ آوے   میں سوختہ ہوں اوس کے لباس اگری کا
کیا بھیجوں کبوتر کے تئیں کوچہ میں جس کے   جبریل کو مقدور نہیں نامہ بری کا
بندہ ہے تیرا مصحفی خستہ کو یارب   محتاج طبیبوں کی نہ کر چارہ گری کا

مجھسے کہتے ہیں تو اوس کا آشنا کیونکر ہوا   کیا کہوں یاروں سے میں یہ ماجرا کیا ہوا
چھیڑ تھی اوس کی طرف سے یا طرف تیری سے روک   یہ تو بتلا دوستی کا ابتدا کیونکر ہوا
صبح تک تو پائے گلبن تھی یہ سرگرم فغاں   یہ نہ بلبل کا قصہ اے صبا کیونکر ہوا

صحرائیاں پورب کیا جانتے ہیں اس کو   اے مصحفی جدا ہے انداز اس زبان کا

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں   دلّی ہی میں چوری میرا دیوان گیا تھا

سر شام اوس نے منہ سے جو رخ نقاب الٹا   نہ غروب ہونے پایا وہیں آفتاب الٹا

جو پھرا کے اس نے منہ کو بقعا نقاب الٹا   ادھر آسماں الٹا ادھر آفتاب الٹا

یہ دم اوس کی وقت رخصت بعد اضطراب الٹا   کہ لہوئے دل مژہ سے وہ نہیں خوں ناب الٹا
ہیں عجب یہ رسم دیکھی مجھے روز عید قرباں   وہی ذبح بھی کرے ہے اور وہی لے ثواب الٹا
نہیں جائے شکوہ اس میں ہمیں مصحفی ہمیشہ   یہ زمانہ کا رہا ہے یونہی انقلاب الٹا

جو دم حقہ کا دوں بولے کہ میں حقہ نہیں پیتا   بھروں جلدی سے گر سلفا کبھی سلفا نہیں پیتا

نتھ کے موتی یوں ہیں اوس مہ کے لبوں کے قریب   یک ستارے کے قریں ہو جوں ستارا دوسرا

عشق کبوتراں میں جو دل اوس کا پھنس گیا   جو آشنا تھا اپنا بگانہ اڑا دیا

داغ چیچک کا وہ تیرا کونسا نظروں نہ چڑھا   کہ میں عزت سے اسے آنکھ کا تارا نہ کیا

یوں ہے پر دود تیرے سوختہ تن کا کپڑا   شمع پر جیسے ہو فانوس کہن کا کپڑا

پانی بھرے ہے یارو یہاں قرمزی دوشالا   لنگی کی سج دکھا کر مستغنی نے مار ڈالا

کاندھے پہ مشک لے کر جب قد کو خم کرے ہے
کافر کا نشہ جس سے ہو جائے ہے دوبالا
دریائے خوں ہیں کیونکر ہم نیم قد نہ ڈوبیں
لنگی کے رنگ سے وہاں جب تا کمر ہو لالا
گرمی سے کیونکہ میری وہ دل کو جھیل نجاوے
چاہ ذقن نے جس کے پیاسوں کو مار ڈالا
اے مصحفی بہشتی سننے نہ آئیں کیوں کر
اس ریختہ میں تو نے عالم نیا نکالا

مجھے رحم آئے ہے حسرت پہ آہ اس مرغ بے پر کے
کہ اُڑ سکتا نہ ہو اور تہ بن پر آشیاں بیٹھا

ایک دن حنا گئی جو بسیر فرنگ پا
دیکھا وہاں شگفتہ تر از لالہ رنگ پا

ہر پور پر اس کی ہو کیونکر نہ میرا جی بند
انگشتوں میں ہے اُس بت کافر کے علی بند

ہاتھ آجاوے جو سیب ذقنِ یار کی گیند
نہ چھوئیں ہم تو کبھی پھر گلِ گلزار کی گیند
ہے یہ غزل دوختۂ سوزن فکر
آصف الدولہ بہادر کی بھی سرکار کی گیند

جست زن جسم میں یوں ہے دل بیتاب کی گیند
جوں کٹھائی میں گرہ کھائے ہے سیماب کی گیند
گوہر با تاب سخن مصحفی ہے تیرا
نذرِ نواب کر اس گوہر نایاب کی گیند

زاہد کے نہیں داغ سیہ ننگ جبیں پہ
ہے آئینہ دل کی لگی زنگ جبیں پر

مصحفی لکھنؤ میں کیا میری قدر
اس خرابہ میں ہوں میں بن کا گل
دستِ معشوق سیم تن کا گل
یوں شگفتہ ہے جیوں چمن کا گل

بن دیکھے جس کے پل میں آنکھیں بھر آئیاں ہوں
کیا قہر ہے جو اوس سے برسوں جدائیاں ہوں

نہیں ہے آشیانہ جس دن جلا چمن میں
کہتے ہیں آتشیں تھی اوس دن ہوا چمن میں

کیا تھا غم دل آشکار ہم نے تو
چھپا رکھا تھا دل کا اضطرار ہم نے تو
ہم اور مصحفی کی کہتے نہیں خدا کی قسم
بہت سہا ستمِ روزگار ہم نے تو
رہے اسیر قفس سالہا ہزار افسوس
نہ دیکھی ایک بھی فصلِ بہار ہم نے تو

آج پلکوں کو جاتے ہیں آنسو
اولٹی گنگا بہاتے ہیں آنسو
آتشِ دل تو خاک بجھتی ہے
اور بھی جی جلاتے ہیں آنسو
خونِ دل کم ہوا مگر جو میرے
آج تھم تھم کے آتے ہیں آنسو
جب تلک دیدہ گریاں ساماں ہو
دل میں کیا جوش کھاتے ہیں آنسو
گوہر دیدہ تمہارے اپنا کے
کس کی یہ لہر کھاتے ہیں آنسو
تیری پازیب کے جو ہیں موتی
اون سے آنکھیں لڑاتے ہیں آنسو
شمع کی طرح ایک رنگ نہیں جب بستر کے
مصحفی کب سماتے ہیں آنسو

حسرت یہ اس مسافرِ بیکس کے روئیے
جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
افسوس کی جگہ ہے کہ دریائے عشق میں
کیا کیا غریب ڈوبے ہیں ساحل کے سامنے

جی سے مجھے چاہ ہے کسی کی
کیا جانے کوئی کسی کے جی کی
شاید رہیو تو اے شبِ ہجر
جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی
رونے پہ میرے جو تم ہنسو ہو
یہ کونسی بات ہے ہنسی کی
گو اب وہ جواں نہیں پہ ہم سے
لت باقی ہے کوئی عاشقی کی
کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا
بو باقی ہے اس میں فارسی کی

کیا چمکے اب فقط میرے نالے کی شاعری
اس عہد میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری
سامان جس طرح کا ہو لڑنے کا جن کے پاس
ہے آجکل انہیں کے مسالے کی شاعری
شاعر رسالہ دار نہ دیکھے نہ میں سنے
ایجاد ہے انہیں کی رسالے کی شاعری
مردِ گلیم پوش کو یہاں پوچھتا ہے کون
گر گرم ہے تو شال دوشالے کی شاعری
یوں شعر گرم گرم پڑھے جاتے یوں نہیں
منہ بولتی ہے گرم نوالے کی شاعری
گر چپچپا بھی ہو گئے تو ہاں سوز کا سا ہو
کس کام کی وگرنہ چھپالے کی شاعری
دیوان جن کے کفش سے افزوں نہیں ذرا
کرتے ہیں کیا وہ لوگ کسالے کی شاعری
جوتی کے کاغذوں پہ چڑھاتے ہیں اپنے شعر
یعنی کہ آ رہی ہے دوالے کی شاعری
بعضوں نے تب تو شعر پہ سر دھن کے یوں کہا
کیا وال پہ ہو بیٹھنے والے کی شاعری
کیسا ہی پڑھ چکے وہ کلام شریف پہ
سر سبز ہو کبھی نہ رذالے کی شاعری

ہوں مصحفی میں تاجر ملک سخن کہ ہے   خسرو کی طرح ہے یہاں املے کی شاعری

دیکھ اوس کو یک آہ ہم نے کر لی   حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی
کیا جانے کوئی کہ گھر میں بیٹھے   اوس شوخ سے راہ ہم نے کر لی
بندہ پر نہ کرو کرم زیادہ   بس بس تری چاہ ہم نے کر لی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا   کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی

انتخاباتِ کلیاتِ مصحفی

قصیدہ، رُباعی وغیرہ

ہجر کی یاد میں گئے شاباش وہ رحمان کے شہید
سُرخرو ہو کے گئے عالم امکاں سے شہید
ماتم شاہ شہیداں کی خبر جب پائیں!
کیوں نہ کاٹیں لب افسوس کو دنداں سے شہید
مژدہ آمد شہ دینے وہ رضواں کو گئے
پیشتر وہ جو ہوئے شاہ شہیداں سے شہید
اپنے حلقوم بریدہ کا بہم پہنسے دن پہ
جلتے ہیں دونے ہوئے دیدۂ گریاں سے شہید
اشک کا آنکھوں میں آنا ہے شجاعت کا ننگ
کام رکھتے نہیں کچھ دیدۂ گریاں سے شہید
تیر عباس کہ پوچھا نہیں تیروں کی سوا
کوئی ہوتے نہ سُنا بارش باراں سے شہید
شوق ہیں سجدۂ خالق کے یہ چاہیں ہیں کہ پھیر
سر کو گردن سے ملالیں کسی عنواں سے شہید
سرنگوں خاک پہ تم ان کو نہ سمجھو بے وجہ
لکھتے ہیں سطر خوں خامۂ مژگاں سے شہید
سر ہیں نیزوں پہ چڑھے دوش ہوا پہ گیسو
شام کو چلتے ہیں کیا یک سر و ساماں سے شہید
قطعہ کیا دشت بلا کا ہے چمن جو اس میں
ابلتے ہیں دست و بغل لالۂ نعماں سے شہید
اپنے سر کو جو کٹاتے ہیں خوشی ہو ہو آپ
کچھ تو پاتے ہیں مزا خنجر براں سے شہید
رنگ صحرا تو ہے زخموں کی انہوں کے بخیہ
شاد ہو کس منہ سے کہیں گردش دوراں سے شہید

دسترس دامن صحرا پہ گریباں کی ہوتی
ڈھانپتے اپنے بدن چشم غزالاں سے شہید
سر پہ ہے سایہ فگن تاج شہادت انکے
ننگ سمجھتے نہیں ہرگز سر عریاں سے شہید
باغ جنت میں ہوئے بال فشاں طائر روح
جبکہ آزاد ہوئے جسم کے زنداں سے شہید
کربلا عرصۂ قیامت کے برابر ہوگا
بن سرے حشر کو جب اٹھینگے میداں سے شہید
صبر پاداش پہ کیتے ہیں سمجھ کر جی میں
معنی آیۂ حسن قتل کو قرآں سے شہید
خوش و خرم انہیں پاتا ہوں مگر جاتے ہیں
گلشن نور میں اس تیرہ شبستاں سے شہید
پیاس آب دم خنجر نے بجھائی ان کی
تھے نہ سیراب جو سرچشمۂ پیکاں سے شہید
خون سے ان کے اگر لالہ بنے کیا ہے عجب
انس جی میں یہی رکھتے ہیں گلستاں سے شہید
نہیں معشوق شہادت پہ نظر گر اون کی
تاک سکتے ہیں یہ کیسے بدیدۂ حیراں سے شہید
انکا مقصود ہے خود اپنا گلا کٹوانا
جان دیتے ہیں کوئی حسرت و حرماں سے شہید
ایک تو سرخی لب دوسری وہ سرخی خوں
گل پہ کیونکر نہ ہنسے پھر لب خنداں سے شہید
سر میں ہے یہی شوق شہادت تو یقیں ہے مجھکو
سر نکالیں گے نئے اور گریباں سے شہید

مصحفی تو تو ہے مداح انہوں کا غالب
نگہ شفقت کریں تجھ پہ دل و جاں سے شہید

حیدر جو سلامی کے سبب جاں سے نکل جائے
نام اوسکا وہیں دفتر عصیاں سے نکل جائے
دم اسکا جو گھٹتا تھا تو کہتی تھی سکینہ
آہوں کا دھواں خانۂ زنداں سے نکل جائے
باسینہ زنی کام ہے عشرہ کی سحر کو
گو تکمہ خورشید گریباں سے نکل جائے
کر لینے دے فضہ اوسکو تو گھڑی بھر دو باتیں
تا حسرت قاسم اسی عنواں سے نکل جائے
ارزق کبھی جو قاسم کے مقابل نہ ٹھہرے
یا تو اوسکا وہیں رزم کے میداں سے نکل جائے

صغریٰ سے ملی آ کے نہ پھر ہائے سکینہ جاں اوسکی اسی حسرت و ارماں سے نکل جائے
ماتم ہے یہ اس شخص کا بس سنتے ہی جس کے ہے ہے یہ دہن گبر و مسلماں سے نکل جائے
گر حور سنے واقعۂ شاہِ شہیداں سر پیٹ کے وہ روضۂ رضواں سے نکل جائے
اس واسطے روتا ہوں میں کہہ کہہ کے حسینا، تا کچھ تو بخار اس دلِ نالاں سے نکل جائے
خوش ہے غمِ شہ میں جو یہ پشتہ برابر نم اشک کے باہر بن مژگاں سے نکل جائے
تھا رحم جو آتا تب عابد پہ اجل کو کہتی تھی یہ اب زحمت بحراں سے نکل جائے
خیمہ میں لعیں آ جو پڑے بولی یہ زینب یہ بادِ خزاں کاش گلستاں سے نکل جائے
اے دل غمِ اصغر میں بھر آتی ہیں آنکھیں یوں ہائے وہ بازی گہ طفلاں سے نکل جائے
رو اتنا کہ طاقت ہو جو تیرے بدن میں سارا ہی وہ رہ دیدۂ گریاں سے نکل جائے
چاہے تھا صفِ جنگ میں ہر ایک دلاور آگے علمِ شاہِ شہیداں سے نکل جائے
پر قصد یہ خاطر سے حسین ابن علی کا، یہاں بات نہ بیجا کوئی انساں سے نکل جائے
شبنم سے یہ ہے روئے دو نداں تا سحر غنچہ کی ہنسی گر لبِ خنداں سے نکل جائے
پوچھا کسے تیر دل کی عباس کہ یہ غم تھا باقی نہ کہیں مشک کا پیکاں سے نکل جائے

جب پائے علم مصحفی یہ نوحہ پڑھوں میں
احسنت لبِ زمزمہ سنجاں سے نکل جائے

سلامی اشک سے یہ چشم مومنیں تر ہے کہ جس سے فرش ہے نمناک اور زمیں تر ہے
جو دستِ شاہ میں تھی خاتم رسول اللہ دکھا دیں کو نہیں کہاں کچھ تو یہ نگیں تر ہے
تمام عمر یہ رویا پدر کے ماتم میں نہ آج کل ہی رخِ زین العابدیں تر ہے
یہ پر ہوئے ہیں شہیدوں کے خون سے نالے کہ قتل گہ کی وہ دود جب از زمیں تر ہے

سپرد کی ہے جو قاسم نے وقت رخصت کے   وہ اشک گریہ کبریٰ سے آستیں تر ہے
بخار عابد بیمار ہے بشدت اور   عرق میں اونکا سراپائے زیں تر ہے
ملک فلک پہ جو ہر لحظہ گریہ کرتے ہیں   اونہوں کے اشک سے تا چرخ ہفتمیں تر ہے
فلک سے یہ عمل ایسا ہوا کہ آج تلک   ہے آفتاب حمل ماہ کی جبیں تر ہے
نہ اک شملہ ہی خوں میں بھرا ہے اصغر کا   کہ اوسکی ٹوپی بھی با زلف عنبریں تر ہے
پسینہ تن سے جو عابد کے پونچھتی تھی زینب   وہ ویم بھی نم ہے جو دامال اولیں تر ہے
کوئی رہا نہیں بن زخم کھائے میداں میں   لہو میں وہاں من شیراں پوستیں تر ہے
زبسکہ کاسہ سر شاہوں کے اتارے ہیں   اک انفعال میں تیغ معاندیں تر ہے
بحال زار شہیدان اوفتادہ بدست   ہر اک غزال کا وہاں دیدہ نمیں تر ہے
لکھیں ہیں حال شہیدوں کا مصحفی کیتک   کہ دیدہ قلم معجز آفریں تر ہے

رباعیات

ہم سمجھتے تھے عمر کو یہ کب آخر ہے   پر غور جو کی کھلا یہ اب آخر ہے
اے مصحفی جاگے بہت اس بزم میں   اب خواب ہی خواب ہے کہ شب آخر ہے

سمجھے ہیں ورد سے بھی لعنت کو یہ خوب   یہ شیوہ نہیں طبع کے اپنے مرغوب
ہے مجلس شیعاں میں اک سنی یوں   جو نکٹوں میں جیسے ناک والا معیوب

دیے آغا نے روپئے چالیس گر   فوت تنخواہ کر گیا بہ خبر
بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی   مصحفی ہاتھ گر لگے کر صبر

ملتی نہیں ہاتھوں سے سیٹھوں کے ہاں   ہوتا ہی رہتا ہے مفت پیسے کا زیاں
تنخواہ تو بارے اب ملتی ہے مصحفی لیکن   بنا تحریر سودی آفت جان

شاہا کہ وسیع ہے تیرا دستِ سخا   گزرے کئی ماہ از رہ لطف و عطا
انعام ہوا تھا جو دوشالہ مجھ کو   رنگ کے لئے ہے وہ کٹھائی میں پڑا

سودا کے خیال کو کوئی سمجھے کم   سودا فن ریختہ میں گزرا رستم
ہے میر تقی بھی تو اگرچہ استاد   پر اوس کے کلام کا ہے قائل عالم

معنی کو جو دیکھے تو ہر دم ہے نیا   گر لفظ کو جھانکیے تو اللہ رے صفا
ہر چند کہ دور اس کا ہے بعد اون کے   ہر شعر کا مصحفی کے عالم ہے جدا

سودا کا تو سرد ہو چکا ہے بازار   اب بزم سخن ہے میرے دم سے گلزار
ہے شان نئی جلوہ گری میں ہر وقت   سچ ہے کہ تجلّی کو نہیں ہے تکرار

جب خاک میں مل گئی جوانی کی بہار   بیٹھا سر در پہ آ کے پیری کا غبار
چالیس برس تو خوابِ غفلت میں کٹے   اے مصحفی اب تو ٹک کہیں ہو بیدار

قابل حمد و ثنا ہے وہ خداوند کریم
جس نے انساں کے تئیں طرز سخن کی تعلیم
مدرکہ کُنہہ کو کیا ذات کی اوس کی پاوے
بہ براہین و دلائل جو نہو میسے تفہیم
عقل اول ہے یہاں سر بگریبان سکوت
جس کو ہے خلقتِ آدم پہ مقدم تقدیم
درک میں جسکے ہیں حیران نفوس فلکی
فکر میں جسکی ہیں مبہوت خیالات حکیم
مرتبہ اوس کا ہے اجسام عناصر سے پرے
صولت اوسکی ہے جگر خون کن اذہان فہیم
دخل صورت نہ ہیولیٰ نے کچھ اس میں پایا
طرفہ تر یہ کہ وہ پھر نسبہ کہاتا ہے قدیم
گرچہ ہے فرد و لیکن نہیں جوہر فرد
کیوں کہ نزد حکما لگتی ہے اس کو تقسیم
اوس کی وحدت سے ہے ہرچند کہ پیدا کثرت
لیکن اعداد کی واجب نہیں اوس کو تکریم
ذات اگر اوس کی نہو علتِ ایجادِ جہاں
تو ہے یہ مسئلہ علت و معلول سقیم

بعضوں کو گماں ہے یہ کہ ہم اہلِ زباں ہیں
دلی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں
پھر تس پہ ستم اور یہ دیکھو کہ عروضی
کہتے ہیں سدا آپ کو اور لاف گزاں ہیں
سیفی کے رسالے پہ بنا اونکی ہے ساری
سو اوس کو بھی گھر بیٹھے وہ آپ ہی نگراں ہیں
ایک ڈیڑھ ورق پڑھ کے وہ جامی کا رسالہ
کرتے ہیں گھمنڈ اپنا کہ ہم قافیہ داں ہیں
نہ حرف جو و قافیہ کے لگتے ہیں کہنے
دانا جو اونہیں سنتے ہیں یہ کہتے ہیں ہاں ہیں
تعقید سے واقف نہ تنافر سے ہیں آگاہ
نہ حرف یہی قافیہ کے ورد زباں ہیں
کرتے ہیں کبھی ذکر وہ ایطائے خفی کا
ایطائے جلی سے کبھی پھر حرف زناں ہیں
اول تو ہے کیا شعر میں ان باتوں سے حاصل
بالفرض جو کچھ ہو بھی تو یہ سب پہ عیاں ہیں
حاصل ہے زمانہ میں جنہیں نظم طبیعی
نظم اون کی کے اشعار یہ از آب رواں ہیں

پروا نہیں کب ہے ردیف اور روی کی — کب قافیہ کی تنگی میں آتش نفساں ہیں
مجھ کو بھی عروض آتی ہے نہ قافیہ چنداں — اک شعر سے گرویدہ مرے پیر و جواں ہیں
سو کیوں نہ دل ہوں میں بھی تو ایسے کا ثنا خواں — جس کیلئے مخلوق یہ سب کون و مکاں ہیں
ماہ عرب اُمّی لقب اعنی کہ محمدؐ — نت جس کی طرف دیدۂ انجم نگراں ہیں

. . . .

نام اوس کے کو کرتے ہیں سدا ورد سخنور — آفاق میں وہ جو خسرو آفاق سخنداں ہیں

. . . .

اے مصطفیٰ ظاہر ہوئے جو معجزے اوس کے — وہ معجزے کب درخور تقریر و بیاں ہیں
اب آنہ میری جان تو سرگرم دعا ہو — خم دیدہ نہ بار قلم تیرے بتاں ہیں
یارب ہے فلک جب تئیں تاروں سے چراغاں — اور اہل زمیں دور سے نظارہ کناں ہیں
دن حشر کے روز ہی ہوا نہیں سایہ طوبیٰ — جو سایہ اعلام محمدؐ میں رواں ہیں
اور جن کو ہے شق القمر اوس کے ہیں قائل — چوں ماہ ہو شق سینہ انہونکا دو جہاں ہیں

قصیدہ در مدح صفدر علی خاں

بسکہ اس فصل میں ہوتے ہیں ہرے عظم رمیم — روکش باد مسیحا ہے گلستاں میں نسیم
نشتر خار کی وہاں سے اُگے ہے سبزہ — بسکہ کرتی ہے ہوا خاک کو لینت تعلیم
صحن ہے صاف تر از دامن دریائے اٹک — لالہ ہے سرخ تر از کاغذ ہندی تقویم
آب جو بار ہے یوں گرد خیاباں کے محیط — ورق لعل پہ جیسے ہو کھینچی جدول سیم
دیکھ صحبت کو بہم لالہ و نافرماں کی — شفق شام نے بھی شام سے کھائی ہے افیم

شعلہ افروز ہے ہر سو جو گلوں سے گلشن　　سطحِ باغ ہے آتشکدۂ ابراہیم
شاہدِ رنگ جدیدی کا ہوا ہے جلوا　　تازگی لائے ہیں شاخوں پہ درختانِ قدیم

. . . .

کیوں نہ ہو ہے بھی تو یہ باغ بناکا اوس کی　　جس کی کرتے ہیں سرِ سدرہ ملائک تعظیم
رنگ خوباں سے گرو مانگے ہے رنگِ گلِ سرخ　　ان دنوں باغ کا عالم ہے بہ از باغِ نعیم
یعنی آں صفدر علی خاں سخاوت پیشہ　　کہ شجاع ابن شجاع است و کریم ابن کریم
حلقہ دورِ فلک خضر جاہ اوس کے ہیں　　ہے سبک وزن ترازِ حلقہ انگشتر سیم

. . . .

برسے گر ابرِ کرم اوس کا بدریائے سراب　　ریگِ ماہی کا وہیں اوگلے وہ صد درِ یتیم
حاتم طے نے کہاں پائی سخاوت ایسی　　ہے یہ وہ ابر کہ برسا دے جگہ آب کے سیم

. . . .

تس پہ گھوڑے کی کہوں کیا میں سبک رفتاری　　سطحِ خاک پہ جوں آپ پہ چلتی ہو نسیم

. . . .

چاہیئے اب تیری حشمت کی دعا کی خاطر　　ہاتھ اوٹھاؤں میں بدرگاہِ خداوندِ کریم
جب تلک دیدۂ بیدار ہیں تاروں کو نصیب　　جب تلک خواب فراغت میں ہیں اصحابِ رقیم
دوستوں کا ہو تیرے ساقی کوثر ساقی!　　دشمنوں کا تیرے مشرب ہے نت چشمۂ حمیم

مرزا محمد تقی ہوس

بس کب تلک تحمل بیدادِ روزگار　　سینہ تو مارے ضبط کے ہو ہو گیا فگار

پہلوئے خشک میں میرے حالت یہ دل کی ہے
ماہی کوئی ہو جیسے کہ قلاب میں شکار
اس آسیائے چرخ نے اہلِ کمال کو
پیسا یہاں تلک کہ ہوئے استخوان غبار
اس سفلہ پروری پہ نظر کر کہ یہ سفیہ
سمجھے ہے اپنا مردمِ دانا کو ننگ و عار
بے بخت و اتفاق کا حکمت سے ارتقا
کچھ کچھ سمجھ کے گوشہ نشیں ہیں بزرگوار
برسوں تلک جو راست روی میں علم رہے
اب کہتا ہوں اون کو فلاکت سے پائے فگار
اب اون کو دسترس نہیں اک پائے مور پہ
رکھتے تھے جو جہان میں سلیمان کا اقتدار
گل کونسا کھلا کہ نہ موجِ نسیم نے
تیغ جفا سے سینہ کو اوس کے کیا فگار
یہ ہاتھ اُٹھا کے خونِ شہیداں سے دادخواہ
بیوجہ مت زمیں پہ سمجھ جوشش لالہ زار
بہرِ خدا سنش آبلہ ،، پا یہ کینہ جو
دیوے ہے نوک سبزہ کو تعلیم نوکِ خار
پائے قرار لنگ ہے میرا ابھی کیا کروں
ازبسکہ اس کے تیر جفا کا میں ہوں شکار
تدبیر سوجھتی نہیں الا کہ جاؤں اب
ہو دادخواہ بر در نواب جسم وقار
مرزا تقی بعرفِ محمد تقی کہ ہے
ادنا مصاحب اوسکا فلاطون روزگار

. . . .

گر اوسکے احتساب کا خطرہ نہیں تو پھر
جا کر چھپا ہے دیدۂ نرگس میں کیوں خمار

. . . .

کیا اوس کے توشہ خانہ کا مذکور کیجئے
جس کارگہہ کا اطلس گردوں ہو جامہ وار

. . . .

کشمیر لے گئی تھی صبا اوس کی بوئے خلق
صرف دعا ہے اب تئیں وہاں پنجۂ چنار

. . . .

سونڈ اوس کی یکہ رنگی ہوئی یوں کہے ہے خلق   آغوشِ صبح میں ہے یہ گلدستۂ بہار
خورشید و مہ سے کم نہیں بالا اسکی جھول   تاروں پہ اوس کے کہتے ہیں تارے گہر نثار
برقِ جہندہ پلٹے ہے کب اوس کی چال کو   جاتا ہے یوں ہوا میں کہ جوں بادِ نو بہار

. . . .

باآنکہ مثنوی و قصیدہ ہیں مصحفی!   میرزا و میر کا ہے میرا خامہ یادگار
کرتا نہیں میں اسپہ بھی لافِ سخن ہنوز   شیوا مرا رہا ہے زبس عجز و انکسار
لازم ہے یہ کہ اب بدعا ہوں ترانہ سنج   بہر دوامِ دولتِ ممدوح دیں شعار
یارب ہے جب تلک مہ و خورشید چرخ پر   اور چرخ کا ہے گردشِ ایام پہ مدار
قائم رہے ہے تو مسند حشمت پہ مثل قطب   گردش ہیں مدعی رہیں تیرے ستارہ وار

ایضاً (یعنی مدح مرزا محمد تقی)

. . . . . ناں کو جو وہ تازہ نہال   قالب فرش کرے اوٹھ کے چمن استقبال
ہے ربیع کا جو اترا ہوا ہر سو لشکر   علم سبز نظر آتی ہے گیہوں کی بال
قوت نامیہ کے فیض سے کچھ دور نہیں   برگِ گل برلاوے بیاباں میں اگر شاخِ غزال
کہنگی تھی جو درختوں کی وہ سب دور ہوئی   نکلے پھر پتّے ہرے اور نیا آیا سال
شاہدِ گل نے کیا اپنا نگارین پنجہ   خندقِ غنچہ نظر آنے لگی کیسہ لال

. . . .

ہے فواروں سے ہیں معمور چمن ہے سرسبز   موج مارے ہے لبِ جو سے پڑا آتا ہے ابال
چل بیٹھے وہ صحن میں اوس بحرِ سخا کے لکھوں   سامنے جسکے فلک کفچہ کیسے سرِ سوال

یعنی مرزا تقی آن واسطۂ علم و عمل
منبع جود و عطا مرجع اربابِ کمال

. . . .

اوس کی مشک پہ ہے کچھ آگ کا جلوہ اس طرح
کالے بادل میں نظر آوے ہے جس طرح ہلال

. . . .

صورِ علمیہ میں جب تیرا ثانی ہو محال
کلکِ اندیشہ لکھے پھر ترے کیونکہ تمثال

مصحفی ہو چکا ہے مدح کا سب عرصہ طے
بجز دُعا اور نہ کچھ حرف تو مُنہ سے نکال

شب تیرا خیمہ رہے ہے خیمہ گردوں سے بلند
مہ و خورشید سواری کے ترے ہوں نگھبال

دونوں فرزند تیرے سایہ میں یُوں شاد رہیں
آسماں کے مہ و خورشید ہیں جوں زیرِ ظلال

مدح مرزا تقی

اس سال ہے سردی کی یہ تاثیر ہوا پہ
جوں موج ہوا تنگ کی ہے زنجیر ہوا پہ

. . . .

ہم پاس تو پٹو ہے نہ دُھسا نہ دوشالا
تحت اون کے ہیں لرکتے ہیں جو جاگیر ہوا پہ

. . . .

اے بانیِ قلم مدح طراز اوس کے تو اب ہو
ان روزوں ہے جس شخص کی تقریر ہوا پہ

مرزا تقی یعنی ہے ہوس جن کا تخلص
ہے جس کے گل نظم کی توقیر ہوا پہ

. . . .

پرواز سخن میں تیرے اے مصحفی خامہ
ہے شعلہ ادراک کا گلگیر ہوا پہ

اب وقت دعا ہے بدعا ختم سخن کر
کیا فائدہ جلنے سے تیری تقریر ہوا پہ

جب تلک ہے ستاروں سے فلک بیچ کبوتر　　جب تلک کہ اوڑے طائر تقدیر ہوا پر
بسکہ تیرے دوست رخ نار نہ دیکھیں　　اور خاک کی دشمن کی ہو تشہیر ہوا پر

جواب قصیدہ انشاء اللہ خاں

کھل گئے منہ پہ میرے شب جو در خواب کے پٹ　　نظر آئی مجھے اک طرفہ بہو کا نٹ کھٹ
حسن کا اوس کے یہ عالم کہ پری دیکھ جسے　　دوڑ کر لینے لگے وہ نہیں بلائیں چٹ پٹ
جگت اور پھبتی میں استاد طریقت الشیطان　　ہنسی اور ٹھٹھے میں چالاک تو جھگڑے میں پھٹ
نسبت اور ضلع کے انداز نظر ہیں اوس کی　　جس سے سیکھے ہو نکھ ہاٹ وہ نہیں بابا رے ڈٹ

.. ..

دوش در آئینہ نور تجلی جوں شمع　　تن میں شیشہ کی صفا چہرے میں شعلہ کی لپٹ

.. ..

مدہ میں جوبن کے ٹپکتی ہے یہ اوس کے مستی　　جس کی مستی مئے منہ زور کو سمجھے تلچھٹ

.. ..

نافہ تنگ سینہ میں اسیر وحشت اوسکی　　گویا میدے سے بنائی ہے وہ لعبت جھٹ پٹ
کرتی ہے جنبش مژگان سے جبیں چیں پیدا　　بدن صاف میں پڑتی تھی نگہہ سے سلوٹ

.. ..

جنگلے اور جھنجھوٹے سے اوسے ذوق زیاد　　کبھی وہ رام کلی اور کبھی کالی ہے نٹ

.. ..

جس کا منہ کور کیا میں یہ بت شہر آشوب   نئی کھڑی طرف چمن مکھڑے سے الٹے گھونگھٹ
اوس سے پوچھا میں کہ تو کون ہے کس کا ہے یہ باغ   جسکے پھولوں نہیں ہے دولہن کے چھپر کھٹ کی لپیٹ
عطر سے مہکے ہیں پر شے یہ تمامی کے تمام   یا کہ پریوں کے پسینے میں بسا ہے ہر کھٹ

. .   . .

اور یہ گلزار جو ہے جس میں ہے؟ شاہی خیمہ   ہے مکاں اوسکا جسے سمجھے علیسی انٹ
یعنی شاداب علی خاں سخاوت پیشہ   جسکی بخشش سے گیا مان کا دم ؟ . .

مطلع ثانی

صبح یہ دا جو گیا اوس گل عارض سے اولٹ   کھل گئے صاف عروساں چمن کے گھونگٹ
اشک دوڑے ہے میرے بدن پر اس طرح ؛   بانس پہ چڑھ کے کرے جیسے رسن بازی نٹ

. .   . .

تیرے دشمن کا گزر ہو جو بسوئے لاہور   سکھ یہ بولی میں کہیں اپنی کہ ٹھہری پول سٹ
صاحب حلم و جلادت ہے تو ہر شام و سحر   آئے مریخ تیرے سامنے بولے ہے رپٹ
ملک گیری ہیں گورنر تجھے سمجھے جو فلک   ہوویں پھر کیوں نہ کلکٹر تیرے لیٹ اور الٹ
سارے عالم میں تیرا حکم ہے دائر سائر   کیوں حاضر رہیں در پر اپیل اور کورٹ
دیکھ کر قصر معلی کا تیرے نقش و نگار   اپنی کوٹھی کو کرے اوس پہ تصدق ارنٹ

. .   . .

اس کے احوال پہ ہووے کچھ لطف ذرا   یعنی یہ مصحفی زار و پریشان ہے پنٹ
شرح پہ اسکی نظر کیجیے بچشم انصاف   نقد عمر اسکا گیا ہے ابھی ہوتے ہیں پلٹ

اس سا مداح کوئی اور نہ تجھ سا ممدوح — تا کجا دیکھے زمانہ کی یہ سنگیں جھنجھٹ

مدح اسپان نواب جلال الدولہ بہادر

یمنی ہے لالہ رنگ تو پکھراج ڈہڑ ہا — خود لعل بے بہا ہے تیرا لال بے بہا
گو برق بیقراری میں یمنی کے ڈھنگ میں — صرصر خرام وہ ہے تو یہ . . . . صبا
وہ جاکہ بول گاہ تھی پکھراج کی تیرے — وہاں سے اُگے ہے زرد چنبلی ہی بارہا
ہر یک پون کا پوت ہے ہر یک پری کی شکل — ہر یک کے چاروں پاؤں ہیں پرواز میں سدا
سم وہ سڈول اون کے جنہیں ماہ چاردہ — سجدے کیا کرے ہے سدا سر جھکا جھکا
چتون میں اون کے سرمہ شوخی کی دو سواد — چشم پری بھی جس پہ کرے آپ کو فدا

. . . .

مطلع

ہیبت میں ہے وہ شیر نیستاں بیشہ ہا — قیمت میں ہے دو لاکھ روپئے کی خرید کا
اوس کی صفائے جلد کے عالم کو دیکھ کر — رُوح القدس نے پیرہن اپنا قبا کیا
زوار جانتے ہیں کہ اوس وہم سیر کو — اک گام کاظمیں ہے دو گام کربلا

در جواب مرزا رفیع سودا

شب دوشینہ دیکھی میں نے پلنگ پر جو پلک — اک پری کی سی شباہت گئی نظروں میں جھلک
نیم وا چشم خماریں کا یہ عالم اوس کی، — جس طرح غنچۂ نرگس کھلے اندک اندک
سر پہ شبنم کا وہ شفاف دوپٹہ سادا — چاندنی دیکھ جسے دُور سے رہ گئی بھوچک

. . . .

سرخی چشم سے کافر کی یہ عالم پیدا   جیسے شیشہ میں ہو رنگ مے گلگوں کی جھلک
جس طرح ماہ کو آغوش میں لیوے ہالہ   گرد یوں سیب زنخداں کے تھی وہ نتھ کی لٹک

مطلع ثانی

ٹھہرے کب چہرہ پہ اوس کے نگہہ پیر فلک   مہر و ماہ کی نہ رکھے آنکھوں پہ جبتک عینک
بولی ناگاہ تو کیا سوتے ہے اب اے غافل   صبح نوروز سے اس صبح کی مانا ہے دمک

……

آج کا روز ہے وہ روز جلوس نواب   جس سے دو چند ہوئی صدر وزارت کی بھڑک
جشن سالِ نو اسی جشن معلیٰ کا ہے نام   ساز عشرت نہ کریں کیونکہ بزرگ و کوچک
صاحب دبدبہ نواب یمین الدولہ   جس کی شمشیر سے مانگے ہے اماں ترک فلک
رحم کو دیکھئے تیرے تو ہے اللہ کا رحم   شعلہ قہر میں پر نکلے ہے بجلی کی کڑک

……

مصحفی ہے جو دعاگو ترا نواب وزیر
اس کے احوال پہ بھی تو متوجہ ہو تنک

مدحِ کلبِ علیخان

لیتے خمیازہ جو اُس گل کی گئی چولی چس   جا پڑی صاف بدن پہ نگہہ اہلِ ہوس
غنچہ گل کے ہوئے ایسے وہ معروف کہ بس   ہمصفیراں نے نہ کی یاد اسیرانِ قفس
ساتھ ناقہ کے جو کی گرم روی مجنوں نے   تپشِ ریگ بیاباں سے گئے پاؤں جھلس

کشتی چرخ نہ طوفاں میں آجائے کہیں   دن ہیں برسات کے اے ابر مژہ تو نہ برس
تا قیامت کبھی بیدار نہو وہ مسموم   افعی زلف بتاں جس کے تئیں جاوے ڈس
بسکہ میں ضبط غم عشق کیا ہجراں میں   پھوٹ کی طرح سے سینہ گیا یکلخت بکس

مدح نواب غازی الدین حیدر

اگر نزاکت موئے میاں کرے تحریر   شکست چینی فغفور ہو شکست پذیر
نہ نکلے کام جو آہن دلوں سے دنیا میں   جگہ نہ خار کو پیکاں کے دل میں دیوے تیر

نشب گزشتہ میں تھا سوچ میں کہ کیا کیجئے   کہ جس سے دور ہو فی الجملہ اضطراب ضمیر
کہ اتنے میں مجھے یوں غیب سے ندا آئی   کہ اے لعین سخن یہ نہ انوری نہ ظہیر
ہوا ہے صدر وزارت پہ جلوہ فرما آج   فروغ نجم سعادت وزیر ابن وزیر
تو اوس کی مدح میں لکھ وہ قصیدہ غرا   کہ جس کی نظم پہ گوہر کریں نثار حریر
یہ اوسکا اسم مبارک جو غازی الدین ہے   غزا میں حیدر صفدر سے کم نہیں یہ نظیر

…… ……

غلط شعاع نہیں یہ کہ اوس نے گردوں پر   کمند پھینک کے خورشید کو کیا ہے اسیر
کرے گر اوسکو نشانہ وہ اپنے تیر دل کا   تمام سد سکندر ہو صورت کفگیر

…… ……

بسوئے خاتمہ ہوتی ہے اب رجوع کلام   نہووے صرف دعا کس طرح قلم کی صریر

الٰہی صدر وزارت پہ تا صدوسی سال
رہے تو قائم و دائم بحکم رب قدیر
کلاہ سر سے اوتاریں تمام عیسائی
جھکاویں جبہ تیرے در پہ صاحبان سریر

……

یہ مصحفی جو ترا مدح گو ہے عال کے بیچ
کہے تھے اس نے قصیدے بہت بطرح وزیر
حسد سے اوسکی ترقی کی رہبری کسی نے وہاں
نہ کچھ اسی سے بن آئی تلاش کے تدبیر
فشار قبر ہے اس کو یہ مفلسی کا فشار
ہر ایک موج ہوا بلکہ درۂ تعزیر

مدح کلب علی خان

برج حمل میں نیر اعظم کا ہے گزار
کیونکر نہ ہو وضع دگر رنگ روزگار
جوش خروش دیولہ نامیہ سے ہے
گلہائے نو دمیدہ کے آگے بنے گلزار
گلگوں سوار لالہ نعماں کے روبرو
ہے گرد دستہ ہائے قزلباش کی قطار
خود پھوٹ کی طرح سے پکستا ہے اسکا پوست
کیونکر کرے نہ خندۂ دندان نما انار
ششدر رہے ہے اسکو دیکھ کے چرخ زبرجدیں
مہندی کی ٹٹیوں نے بنایا ہے جو حصار

……

پھولوں کی سمت دیکھئے گر آب کی سال ہے
سب سے زیادہ فاختہ رنگی پہ ہے بہار
یہ چاہیئے مجھے کہ میں ایسی بہار میں
نوروز کا قصیدہ لکھوں کوئی آبدار
اوس کیلئے کہ نام ہے جس فخر خلق کا
فیاض دہر کلب علی خان جسم وقار
بحر علا و کان سخا مظہر کرم
دریا نوال و حاتم ثانی روزگار

دانش سے اس کی حکمت لقمان کو بولنا   ہرگز نہیں ہے مجھ سی سخن سنج کا شعار

..   ..

یارب ہے جب تلک کہ زمانہ میں رسم عید   اور جب تلک ہے عشرت نوروز برقرار

..   ..

ہر روز اسکو عشرت نوروز ہو نصیب   ہر شب رہے یہ شاہد مقصد سے ہمکنار

ایضاً مدح کلب علی خان

زبسکہ شوق جنوں ہے میرا گریباں گیر   ہر ایک تار سے آتا ہے نالۂ زنجیر
نہ نکلی اوس میں ذرا حسرت دل عاشق   شب وصال تھی اک پل سی بھی بسکہ قصیر
فلک کو ہے مہ و خورشید پہ بڑا غرا   کہ کی ہے دعوت یک خلق بر دو ناں فتیر
تونگری نہیں کچھ بے بصر کے کام آتی   شعاع مہر سے روشن نہوئے چشم ضریر
اگر حقیر ہوں میں مجھکو غم نہیں اس کا   خدا کے فضل سے میرا نہیں سخن تو حقیر

..   ..

جو اٹھ گیا کوئی مسند سے بزم ہستی کی   تو اوس پہ اوسکی جگہ دوسرا ہوا جاگیر

..   ..

گر ایک مرغ کہن نغمہ ہو گیا خاموش   ترانہ زن ہوا گلشن میں اور تازہ صفیر
یہ کارخانہ معطل کبھی نہیں رہتا   ہمیشہ کام میں اپنے ہی دور چرخ اثیر
ہزار حیف کہ دنیا سے چل بسے سب یاں   نہ سوز و قایم و سودا رہا نہ درد نہ میر
خدا رکھے تجھے اے مصحفی کہ اب تو ہے   عوض سبھوں کے نوا سنج گلشن تقریر

غلط کیا ہیں فقط تھے وہ مردِ ریختہ گو ہیں تیری فارسی کے بھی مقر صغیر و کبیر
وگر انہوں نے بھی کچھ اسمیں نظم کی کم و بیش کلام اونکا نہ پہنچا بہ رتبۂ توقیر
تیرا کلام کہاں اور کہاں وہ ریختہ گو وہ شکل خوشہ پروین تو شکل بدر منیر
سوائے اس کے اگر نثر تو لکھے اوس میں براز وحید و ابوالفضل ہو تیری تحریر

. . . .

کچھ ایک علم ہیں منطق کے ہی نہیں تجھکو دخل کہ ہے تصوّر و تصدیق کا تو تحربہ کبیر

. . . .

اصول علم ریاضی ہیں گو نہو وہ کمال کہ تجھکو کہتے تفضّل حسین خان کا نظیر

. . . .

بقدر حال ہے ہر فن میں تجھکو درک درست جو قدرداں نہ ملے اس میں کیا تیری تقصیر
زمانہ عرصہ میں لایا ہے تجھ سا جامع کم عجب نہیں جو میری خاک تن ہو سب اکسیر
کہ مدح گو ہے تو ایسے کا آج دُنیا میں کہ جس کے دست نگر ہیں ابھی صغیر و کبیر

ایضاً (مدح کلب علیخان)

ہو نباتات میں جب روح نباتی کا عمل شجر خشک سے کیوں برگ برآویں نہ نکل
جوش صد برگ سے ہو کیوں نہ زمیں کان طلا سبزہ کیوں اوس پہ بچھاوے نہ وہ خواب مخمل

. . . .

جی میں آتا ہے کہ ٹھہرا یہ جو تشبیب کا ہے جسم بھی اسکو وہ دوں جسپہ نظر آجائے پھسل
از پئے کلب علی خان بہادر لکھوں وہ قصیدہ کہ کرے وجد جریر و اخطل

. . . .

اس کے دانتوں کا یہ کہنا ہے فروغ بشرہ　　شب تاریک میں روشن ہے وہ دستی مشعل

مدح نواب معتمد الدولہ بہادر

کیا ہے مجھ پہ یہ جور فلک نے عرصہ تنگ　　کہ رات دن ہوں نصیبوں سے اپنے برسر جنگ

.. ..

نہ نکلی آرزوئے دل کبھی ہزار افسوس　　اسی طرح سے رہی میری جی کی جی میں امنگ

.. ..

ذلیل و خوار ہوں آنکھوں میں خلق کی اتنا　　کہ میرے نام سے آتی ہے میرے نام کو ننگ
یہی ہے سوچ مجھے رات دن خداوندا　　ہوا ہے دشمن جاں کیوں میرا یہ پیر زنگ؟
رہِ فرار تو کوئی نظر نہیں آتی　　عیاں ہیں رخ سے میرے معنی شکستن رنگ
جناب معتمد الدولہ وحید زمان　　مگر ہو داد رس اس دم کہ ہوں نپٹ میں تنگ
ملی ہے اس کو نیابت وزیر کے گھر سے　　گیا ہے شہرہ جود اسکا تا بہ چین و فرنگ

.. ..

نہ حور بچہ کوئی دیکھا اس قدر گورا　　نہ دیو زاد کوئی دیکھا اس طرح کا بھجنگ

مدح نواب روشن الدولہ

قلمدان زیر کرسی کیوں نہ رکھے فکر خاقانی　　میرے زانو سے پھر پیدا ہوا ہے ربط پیشانی

سوئے اسباب ظاہر ہے خیال عقل بالکیہ؟   سفر دنیا سے کب کا کر گئی عقل ہیولانی،
پرے ہے لامکاں سے بھی نشیمن فکر کا میرے   وہاں پہنچا ہوں میں جس جا نہ پہنچے درک انسانی
میں تھا طفلی میں وہ شیر گلی ماہ محرم کا   دہن سے رال بھی کرتی تھی جسکی آتش افشانی
فغاں سے میری بلبل کر رہی ہے نالہ موزوں   سکھائی میں نے ہی برگ گل سوسن کو لسانی؛

…… ……

ارسطو نے لیا درس خرد استاد سے میرے   فلاطوں نے کئے تہ زانو از بہر سبق خوانی
خدا اس بات کا شاہد ہے گر اس عہد میں ہوتا   فصاحت دیکھ سحباں بھول جاتا اپنی سحبانی
سخن گوئی کے عالم میں من اللہ میں مؤید ہوں   کرے جو مجھ سے دعوی مدعی کھینچے پشیمانی

…… ……

جہاں میں اور بھی شاعر ہیں لیکن ختم ہے مجھ پر   سخن فہمی، سخن گوئی، سخن سنجی، سخن رانی
یہ دعوی ہے دلیل اے صاحبو کرتا نہیں میں کچھ   ہے اس پہ حجت قاطع مرے خامہ کی رجحانی؛
سوا اسکے دلیل اک دوسری یہ ہے کہ کرتا ہوں   میں ایسے صاحب جاہ و تجمل کی ثنا خوانی
اگر حاتم مکرر خلق ہوتا عہد میں اوس کے   سمجھتا اپنا فخر خانداں اس در کی دربانی
وہ نواب ثریا جاہ یعنی روشن الدولہ   کہ روشن مہر رخ سے جسکے ہیں ذرات امکانی

…… ……

کلجک ماتھے پہ اوسکے ماہ نو جوں چرخ نیلی پر   ویسے چاندی کا عرضہ شکل بدر کیل ظلمانی
جو کوئی دیکھتا ہے تجھ کو بیٹھا اوس میں کہتا ہے   ثنا ور نیل کے دریا میں ہے یہ یوسف ثانی

ایضاً مدح نواب روشن الدولہ

نسیم مژدہ لائی سحر بسوئے حمام   کہ صبح سے ہوں مہیائے کار سب خدام

کریں نہانے کے کیسہ درست حمامی   بناویں غازہ و خوشبوئے خا.. مشام
جو گرم کن ہیں سمودیں گھڑے وہ پانی کے   جو آبپاش ہیں اپنی جگہ کریں وہ قیام
لگن بنیں نہ وہ خورشید پائے شوئی کے   ہوں آب ریزی کے ظرف اختر آں ہیں...
بوقت صبح شفق آکے ہو کمر بستہ   نچوڑنے کے لئے آپ لنگی حمام
سفید کھیس کو اپنی سحر رکھے تیار   کہ اوڑھ لیوے نہا کر اسے وہ سیم اندام
یہ روز جشن ہے غسل شفا کا اوس مہ کے   کہ مہر سر کو جھکا کر جسے کرے ہے سلام
سپہر مرتبہ نواب روشن الدولہ   گل حدیقہ دولت ضیائے ماہ . . .
زہے سخائے مجسم کہ جس کا دست کرم   بھرے ہے کاسہ سایل کو موتیوں سے مدام

.. ..

شبیہہ سوجھی یہ خرطوم اور دنداں سے   وہ صبح عید ہیں گردو یہ روز عیش کی شام

قصیدہ

میں ایک رات جو تھا غم کے ساتھ ہم بستر   صبا نے مژدہ دیا آکے مجکو وقت سحر
کہ چونک سکھ ناکے ایسے مست خواب غفلت   میں تیرے واسطے لائی ہوں اک خوشی کی خبر
کھلی جو آنکھ تو..... یہ ہیں رہ گیا وہ نہیں   سرہانے دیکھی کھڑی اک پری پیکر
برنگ غنچہ لب شرمگیں تبسم زا   جمال و حسن ہیں غیرت فزائے شمس و قمر

.. ..

نگاہ سایۂ مژگاں میں آہوئے وحشی   کرشمہ و نرگس فتاں میں ہم عناں شرر

.. ..

ازار بند وہ لچھے کا برق خرمن ہوش   کہ جسکی قرص پہ خورشید کھائے تھا چکر
چڑھا ہوا وہ ہرے گلبدن کا پاجامہ   کہ جسکا رنگ شفق دیکھ رہ گئی ششدر

مدح نواب ہادی علیخاں

اے خامہ چاہیے کہ تو ہو زابتدائے کار   صرف ثنائے ہادی علی خاں جسم وقار
وارستگی مزاج میں اس تمکنت کے ساتھ   اینجا دلیل دست بکار است و دِل نثار

مدح میر فضل علی

یہ چاہتی ہے طبیعت بحکم رب قدیر   کہ ریختہ کی زمین سخن میں ہو تعمیر
دکھا دے ناطقہ خوبی زبان اُردو کی   قلم معانی نازک رقم کرے تحریر
نہ پہنچے جس کے تئیں نقش خامہ سودا   نہ پا سکے لب و لہجہ کو جسکے دعوئ میر
اگرچہ فارسی گوئی ہے میری مشق نخست   زبان ریختہ کو جان و دیمی تصویر
مصور دو قلم ہوں میں حسن معنی میں   ہے جامع زاد میر النقشہ صغیر و کبیر
غزل کی طرز میں سعدی پہ حرف ہے مجکو   قصیدہ گوئی میں ہوں رشک نقش کلک ظہیر
ہے میرے شعر کا مشتاق اصفہاں میں ضیا   ہے میری نظم کا جو بندہ بیلقا میں بجیر
جو سادہ گوئی پہ آؤں تو ہوں فصیحی وقت   جو معنی بندی پہ جاؤں تو ہوں جلال اسیر
میں صدر بزم سخن ہوں کہ اہل معنی میں   میرے کلام سے ہے بیشتر میری توقیر

غلط جو کچھ میں کہا کس طرف خیال گیا نہ میں نظیر کسی کا نہ کوئی میرا نظیر
جو اہل ہوش ہیں ہوتی ہے آئینہ اُن پہ میری صفائے سخن سے میری صفائے ضمیر
وے مناسبِ حالِ زبوں نہیں میرے زیادہ اپنے دہن سے جو کچھ کروں تقریر
مبادا طبع پہ احباب کی گراں گذرے نزاکت سخن نرم ہو نہ مئے خمیر
بس اس سے اب ہے یہ لازم کروں میں عطف عنان بسوئے مدح کسے کو بود رئیس و امیر
یگانہ صاحب اقبال میر فضل علی کہ منفعل ہے ترشح سے جسکے ابر مطیر
اُٹھے وہ بستر راحت سے مجرم بیتا. جو دیکھے خواب میں ہنگام درا اسکی صریر
کسے ملے ہے یہ سرمہ کہ کور مادر زاد کرے ہیں ایک سلائی نے جسکی لاکھوں بصیر
گر ایک چٹکی بھی اوسکی کسی کے ہاتھ لگے زمانہ نام رکھے اوس کا صاحب اکسیر

.. ..

لگی تھی ہاتھ سلیمان کے تیری انگشتر تب ہی تو دیو پری اوس نے کر لئے تسخیر
کہاں یہ مرتبہ رکھتا تھا حاتم طائی تری سخا سے سخاوت ہے اوسکی عشر عشیر

ایضاً میر فضل علی

جب حوت سے حمل میں ہوا مہر کا گذار دن... کے زہرہ کی ساعت کے اختیار
اہل طرب نے ساز طرب کوک کر لئے گلبانگ مطرباں کی گئی آسماں سے پار
پھر تالیاں بجانے لگے برگ ہر درخت باد صبا کو دیکھ کے رقصاں و بیقرار
رنگ ارغوانی دیکھ کے اوسکا یہ بولی خلق معشوق خوبرو ہے کہ گھوڑے پہ ہے سوار
سکان زیر خاک کے دل کو ہوئی خوشی پیک صبا نے دی خبر آمدِ بہار

لالوں نے رنگ رنگ کی مے کے بھرے جو جام   پی کر کے اونکو ہو گیا ہر مست کو کنار
نورستہ رستنی نے نکالا زمیں سے سر   پھر کچھ پکڑ کے چلنے لگی آب جوئبار
چوں شاخہائے سبز کے آئے نظر نشاں   باغ جہاں سے فوج خزاں کر گئی فرار

پہنے ہوئے ہیں بر میں لباس بہشتیاں   اوراق سبز سے تن عریاں شاخسار
نرگس کے گرد پھولوں سے لالہ کے ہے عیاں   اوس کے لگی ہے ہاتھ قلمکار جامہ وار

. . . .

سوچا ہیں دل میں دیکھ کے نسریں کی کیاریاں   مثل فلک ہے سطح زمیں کیوں ستارہ وار
. . . صرف سجدہ خالق ہیں رات دن   گلشن میں شاخہائے درختان میوہ دار
یا اب یہ رنگ ہے کہ دو گل کو گئی ہے بھول   بلبل کے دل میں چبھتی تھی یا کہ نوک خار
اسکو بھی چشم لطف سے دیکھے ہے باغباں   پاتا چلا ہے سبزہ بیگانہ اعتبار
چوں آسمان سبز پہ ماہ دو ہفتہ ہو   ایسی صفا سے چمکے ہے سبزہ میں آبشار

کوئی زمیں سادہ نہ دیکھی کہ وہ نہ ہو   سر سبزی بہار سے ہمرنگ مرغزار
اے خامہ طول دے نہ تشبیب کو اسقدر   ایام آگئے ہیں کہ چمن مدح میں گزار
اوسکی کہ جسکا اسم مبارک بوقت رنج   ہو شخص کم بغل کے لئے دافع مضار
عالی نسب بلند حسب صاحب اقتدار   کہتا ہے میر فضل علی جس کو روزگار

ہے غرض یہ کہ ایسی توجہ بلیغ ہو   تا جس سے ہو یہ شاہد مطلب سے ہمکنار

معمول کے سوا بھی تو کچھ اسکو ہو عطا   یعنی مشاہرے کا ہے عاصی امیدوار
جاوے نہ اور در پہ برائے حصول نان   مانند نقش پا اسی در پر رکھے قرار
دریا کا آب کم نہیں ہوتا کسی طرح   ہر چند تشنہ جاوے چڑھا خم کے خم ہزار

قصیدہ ایضاً میر فضل علی داروغہ بادشاہ بیگم

رکھے ہیں جب سے صنم تم نے بے حساب قلم   ثنائیں اونکی سیاہی کے ہے خراب قلم
قصیدہ تہنیت عید میں کیا میں رقم   الٰہی مجھکو کرے جلد کامیاب قلم

مدح نواب معتمد الدولہ بہادر

آتا ہے جب سے دیکھ رخ دلبر آفتاب   کھاتا ہے اوسکے نام پہ نت جگر آفتاب
یاقوت جور سے تیرے عالم ہے بیخبر   جیسے کہ پشت کوہ میں ہو مضمر آفتاب
روشنی اس کی ہے یہ بیضا کی روشنی   ہو کیوں سکے روشنی کا تیری ہمسر آفتاب

تمت تمام شد قصیدہ تصنیف میاں مصحفی صاحب بخط خام بندہ
اجودھیا پرشاد برائے ملازمان جناب اقدس اعلیٰ نواب عاشور علی
خان بہادر دام اقبالہ

جلد دویم قصیدہ جات کہ در شان رسالت مآب ص وآلہ الامجاد علیہ التحیہ

قصیدہ در نعت جناب محمد مصطفیٰ ص

جو ہاتھ آتا میرے یکسر گریباں آستیں دامن
سو تھا وہ چاک سکے درخور گریباں آستیں دامن

یہ دیوانوں کی مجلس ہے تو اٹھ جا یہاں سے اے ناصح
کہ یہاں جنگل میں ہیں اکثر گریباں آستیں دامن

جنوں تو دیکھ میرا اپنے ہاتھوں دھجیاں کرکے
دیا رکھ میں نے آتش پر گریباں آستیں دامن

گئے کھا زخم اوس کی گلی سے سینکڑوں لیکن
ہوا یوں خوں میں کس کا تر گریباں آستیں دامن

صفا سینہ کی یا ساعد کی یا ساق بلوریں کی،
لکھوں ہے جس سے پر خوشتر گریباں آستیں دامن

میرے اشکوں کے موتی ٹانکساون پہ میں تیرے صدقے
کہ ہو تکموں سے زیبا ور گریباں آستیں دامن

اوٹھاوے ہیں چڑھاوے ہیں تنے ہیں اور دکھاوے ہیں
ہمیشہ وہ بت کافر گریباں آستیں دامن

ابھی تو خون کو میرے لذّت آغوش لینے دے
ذرا دھلوائیو رہ کر گریباں آستیں دامن
ہمیں آخر تو پھر اک پل میں ان کو چاک کرنا تھا
بہت پچھتائے ہم سی کر گریباں آستیں دامن
رفو ناصح سے کب ہو چاک پیراہن کا عاشق کے
مگر سلوائیں آں سرورؐ گریباں آستیں دامن
محمدؐ باعثِ ایجاد عالم جس کے جامہ کا
سیئے ادریس پیغمبر گریباں آستیں دامن
جو روئے شوق میں اوس کے عجب کیا ہے کہ ہو اسکا
برنگِ شمع پُر گوہر گریباں آستیں دامن
تمہارا ابرِ رحمت یا محمدؐ مجھ پہ گر برسے
تو ہو پاکیزہ و اطہر گریباں آستیں دامن
وگرنہ مصحفیؔ تو وہ سیہ رو ہے کہ کالا ہو
بدن سے جس کے چھو جا کر گریباں آستیں دامن

قصیدہ ایضاً

شمار داغ سے کب اتنی مجھکو فرصت ہے   کہ رکھ سکوں بسر چشم اشکبار انگشت
بہ تیر آہ کے کس کے لگے ہیں گردوں پہ   جو کہکشاں کی ہوئی اتنی رخنہ دار انگشت
بیان ضرور ہے اب دستۂ تیغ کا اوسکی   نکل گئی سر مہ سے جس کی پار انگشت

محمدؐ عربی معجزوں کا جس کے کبھی نہ کر سکی فلک پیر کی شمار انگشت
چمن میں اوسکی رسالت کا جب کچھ آئے ہے ذکر علم کرے ہے شہادت کی شاخسار انگشت
وظیفہ جس کا پڑھے ہے یہ دانۂ شبنم دعا میں جسکی ہے کھولے ہوئے چنار انگشت
کرے ہے دست قضا جب کسی کا عقدہ وا اوسی کے ہاتھ سے مانگے ہے مستعار انگشت

ایضاً

زینت سے کام رکھتی ہے کب ہمت بلند محتاج کب حنا کا ہوا پنجۂ چنار

.. ..

غافل تو جا کے گور غریباں کی سیر کر ٹوٹے ہوئے پڑے ہیں جہاں سینکڑوں مزار

.. ..

فکر معاش سے تو کرے اپنا دل تہی ، رخصت طلب ہو تجھ سے تمنائے روزگار
ہوتی بسر ہے سب کی بیک نیم پارہ نان حرص و ہوا کو چاہیے تو دے جتنا اختیار
پُر نور اپنا اپنی ہی فہمید سے ہے تو گر چشم عقل ہو دے تیری ٹک بھی تمیزدار
سب بعد مرگ کی بھی کھلے تجھ پہ ماہیت واعظ کے قول پر نہ رکھے چشم انتظار
قرآں سمجھ تو اپنا شب تار میں چراغ! ہمدم سمجھ تو اپنی یہ چشم ستارہ بار
کچھ غم نہیں جو نامہ اعمال ہے سیاہ دھوویگا اس کو ابر کرم اوسکا ایک بار

.. ..

کیا اوس کے معجزوں کا بیاں مجھ سے ہو سکے منہ میں میرے ہو ایک زباں معجزے ہزار

.. ..

اصحاب اوس کے چار ہوں ...
بارہ دری ہے جن سے امامت کی استوا
نے اہل رفض سے ہے مجھے رفض اس قدر
نے شیعان دیں سے میں رکھتا ہوں ننگ و عار
گر سنی کوئی سمجھے مجھے اس کا غم نہیں
کس واسطے کہ تھے یہی میرے بزرگوار
یں شیعہ اک ہوا تو ہوئی کیا مفاخرت
ہونا پڑے ہے یوں بھی تو معطون روزگار
القصہ اس سے کام ہے کیا ہوں محمدی
آگے جو کچھ کہ چاہے کرے لطف کردگار

قصیدہ در منقبت علی مرتضیٰ ع

ملے کر چکی ہے کیا یہ رہ انتظار چشم
پھر ٹک کے ہے میری [illegible] غلطیاں چشم
.. ..
.. ..
مداح چشم یار ہوں بادام کی جگہہ
لائق ہے مجھ پہ گر کریں مردم نثار چشم
پیدا سب ہوئے پہ کبھی [illegible]
فتنہ کی خواب سے نکھولیں زنہار چشم

ایضاً در منقبت جناب امیر علیہ السلام

صورت میں آپ چرخ [illegible] ربنا گرہ
. . . . . ہیلا گرہ
اس بار [illegible] کے ہاتھ سے انجم نہیں ہیں یہ
رشتہ میں کہکشاں کے پڑے جا بجا گرہ
یارب فلک سے کھا گئے کیدھر کوئی جیسے
قطرہ گیا صدف میں تو ہال بھی ہوا گرہ
دیکھا ہے شاید اوس نے کہیں کان کا گہر
گلشن میں آج صبح سے ہے موتیا گرہ
حاجت روا فلک سے ہو کب اپنی مصحفی
کھولیں نہ جب تک آن کے مشکل کشا گرہ

بشیر خدا علی ولی شاہ ذوالفقار بن حکم جس سے کھولے نہ دست قضا گرہ
ہے فتح باب عیش تیرا نام یا علی کھولے نہ بستہ کاروں کی کیونکر بھلا گرہ

ایضاً در منقبت آنحضرتؐ

.... کیا معنی رنگیں کی تلاش خون دل سے ہی سدا جسکو رہے وجہ معاش
اہل دنیا کو ہے روبت سے ہماری ہی خوشی گو مہ عید کی مانند ہوئے ہم قلاّش

قصیدہ ایضاً

گرمی سے مستفیض ہوا عکس آفتاب کیا ہے عجب جو بحر میں ماہی بنے کباب
صفرا کے اختلاط سے سرسام ہو اوسے جائے کسی کے مغز میں گر بوئے مشکناب
آتش فشاں ہے نائرہ خورشید بسکہ روز رُوئے زمین لسان فلک سے سیاہ تاب
گرمی کو سب کہیں ہیں تسلط جہان میں الا بکار خانہ شاہ فلک جناب
یعنی علی کہ جسکی شجاعت کے خوف سے ہنگام جنگ زہرہ روئیں تناں ہو آب
ہو کس طرح سے اوس کے تہمتن مقابلے گردوں دشمنوں کو جن نے زمین میں دیا ہے داب
اے دل وہ بارگاہ بلند اوس کی ہے جسے اہل زمین کہتے ہیں سب آسمان مآب
پائے ثبات اوس کا اگر ہووے درمیان کرنے نہ پاوے رنگ زمانے کا اغتصاب
طبقات آسمان کو سمجھتے ہیں خوانچے از بسکہ با شکوہ ہے مطبخ کے اوس کی تاب
بخشش میں بید رنگ ہے ہاتھ اوسکا اس قدر برسے ہے جس طرح مہ نیساں کبھی سحاب

ازبسکہ اوسکا امر شریعت پہ حکم ہے
جز علم فقہ کے نہیں پڑھتا کوئی کتاب
جز نام حق کسی کی نہیں اب زبان پر
خوانندگان علم سے کیا شیخ کیا ہو شباب
معتاد تھی جنہوں کی مئے ناب شام و صبح
کرتے ہیں اب وہ آب کی صورت سے اجتناب
آباد ہے ہر ایک کا گھر اوس کے عہد میں
جز میفروش کوئی نہیں خانماں خراب
کہنا روا ہے رخش کو تیرے فلک شتاب
مانا ہلال عید سے ہے جس کی ہر رکاب
سرعت رکھے ہے ایسی کہ گر اوسپہ چڑھ کے تو
مشرق سے پھنکے جانب مغرب ملار...
اس عرصہ میں پھرے وہ کہ اوس کی صدائے پا
ہونے نپائے کان تلک تیرے باریاب
ممدوح حق ہیں اور تیرے تعریف کیا کروں
تو ہے کتاب فطرت یزداں کا انتخاب
آیندگاں نہ کیوں کے تیری التجا کریں
ہے علم کا مدینہ پیمبر تو تو ہے باب

ایضاً در منقبت

ڈھاہے جب سے کہ میرا یہ قصر ہشیاری
کرے ہے پیر خرد روز عرض معماری
میں تیرے حسن کو یوسف سے کیونکے نسبت دوں
کہ تو ہے خانہ نشین اور وہ ہے بازاری
کہاں تھیں یاد بہ غمزہ کو شوخیاں آگے
وہ تیری چشم سے سیکھا ہے مردم آزاری
میں اس کے ہاتھ سے ہر صبح و شام جلتا ہوں
بداغ غم ہے کلیجے پہ یا کہ چنگاری
بکے ہے کیا تو عبث ہرزہ سنج پریشان گوئے
دے مدح شاہ میں زلف سخن کو.....
شہ جہاں شجاعت علی عالی قدر
کہ بحر و بر میں سدا نام جس کا ہے جاری
وہ بارگاہ بلند اوسکی ہے کہ جس کو فلک
کرے ہے سجدہ سمجھ کر کے درگہ باری
بزور پیل کو میدان سے ٹال دے وہ نہیں
جو لطف اوسکا کرے مور کی مددگاری

پھر اوس سے عیسیٰ گر، دل نشیں کو کیا نسبت   ہو جس کے نام کے لینے سے رفع بیماری

ایضًا در منقبت آنحضرتؐ

گر فیض سخن ہو چمن آرائے طبیعت   تو گل کو دکھادوں میں تماشائے طبیعت

……

میں مدح کروں اپنی تو کچھ غم نہیں اسکا   پر مجھ سے کبھی ہجو نہ کہوائے طبیعت
کس واسطے یہ شیوہ ہے مذموم اکابر   ہوتا ہے سخن موجب ایذائے طبیعت
شاعر کو یہ لازم ہے کہ گر شعر بھی لکھے   جز مدح کے ہرگز نہ کہیں لائے طبیعت
سو مدح کرتا ہوں اب اوس شخص کی جو ہے   در ملک بلاغت علم آرائے طبیعت
یعنی علی آں جرعہ کش مکتب ابداع   جبریل کہے ہے جسے مُلائے طبیعت
درِ علم کا جس کو کہ محمدؐ نے کہا ہو   اِس در سے نہ کیوں فیضِ سخن پائے طبیعت

ایضًا در منقبت حیدر کرار صاحب ذوالفقار

روز نو روز کرے کیوں نہ دلوں کی صیقل   عکس خورشید سے ہے روکش آئینہ خجل
گل مہتاب میں ایسی ہی صفا ہے کہ نظر   صحن پر اوسکے قدم رکھتے ہی جاتی ہے پھسل
خاک سے مردۂ صد سالہ کے بوسیدہ عظام   سبز ہو کر کے وہ نہیں دانہ سے آتے ہیں نکل
پھول جاتی ہے وہیں آنکھوں نئے سرسوں سی   منتشر ہووے ہی گر خاک میں مشت خردل
باغ میں جا ہے جو شب کو تماشے کیلئے   سبز آتا نظر ہے شعلہ و دودِ مشعل
باغ معمور ہے پھولوں سے کہے تو اس سال   تھا دفینہ جو دبا خاک نے یکبار اوگل

نہ فقط لالے نے کچھ ناز سے کج کی ہی کلاہ
زلف سنبل میں بھی پڑتا ہی ایک انداز سے بل
اب اوسے دیکھو تو ہی عرش پہ اوسکا بھی دماغ
کیونکی نام جو لونڈی تھی چمن کی شفتل
منھ میں شبنم کے بھر آئے ہی ہر دم پانی
بسکہ دل اوسکا گیا ہے رخِ گل پہ پھسل
اس ہوا پیچ تعجب ہے جو مجھ سا شاعر
نہ پڑھے جا کے گلستاں میں ہی یہ تازہ غزل
جس زمیں پر کہ شہیدوں کا ترے تھا مقتل
اب نہ فلک کاٹیں تو فوارہ خون ہے ترسل
جمع ہو کر کے میرے لختِ جگر کے ٹکڑے
ساتھ آنسو کے بہے جیسے کہ دریا میں کنول
اشک آنکھوں میں میرے بھرتے ہیں یوں روزِ وداع
جیسے ہاون میں کرے ریزہ الماس کو حل

ایضاً در منقبت امام حسن علیہ السلام

زبس نقشِ الفت زنار بنداں دل میں پنہانی
گرے آنکھوں سے آنسو بن کے تسبیح سلیمانی

……

مثالِ لالہ گو گلشن کی رکھتا ہوں جہانبانی
نہیں بے داغ ہرگز سرمہ میری تاجِ سلطانی
اگر موئے قلم کو اپنی پاؤں اوسکے سر نسبت دوں
عجب کیا ہو کرے گر مور دعوائے سلیمانی
زباں میری بھی گر وہ دیکھتا تو دنگ ہو جاتا
قیامت گرچہ تھا سحباں کو دعوائے زباندانی
بھلا میرے مرقع کا بھی عالم اک ذرا دیکھو
اگر ہے ہاتھ میں سودا کے یاروں خامہ مانی
قصاید میں مرے اور اوسکے چند اک فرق تو آیا ہے
میں عرفی ہی سہی اس فن کا گر گذرا وہ خاقانی
خموش اے منشی عقبیٰ اب مدح لکھ اوس پاک گوہر کی
کہ جسکے فیض سے قطرہ کرے دعوائے عمانی
امام ثانوی حضرت حسن وہ صاحبِ دانش
رکھے ہے عقل جس کی درکِ عقلِ کل پہ رجحانی

ایضاً در منقبت امام حسین علیہ السلام

خاک چمن نے رنگ نکالا ہے آب کے سال   پھولوں کی ڈالیاں نظر آتی ہیں لال لال
سبزے کی مومیائی سے ہو جائے گی درست   ٹوٹے ہیں گر زمیں پہ کہیں کاسۂ سفال
خاک چمن سے کیوں نہ اگیں پھول لالہ رنگ   یہ خاک اوس ذبیح کے خوں سے ہوئی ہے لال
رنگین کفن . . . . . .   یعنی حسین جس کا نہ پیدا ہوا مثال
ہے یہ خود ذو الجناح تیز جنبش باد شمال   میں اگر یہ سمجھونگا اسکی ثنا کیا میری مجال
سب خوبیوں کا اوسکی بیاں مجھ سے کب ہوا   ہے بس یہی کہ کیجیے مدحت میں قیل و قال
گر گرم پویہ ہوئے تو اک پل کے مارتے   پہنچے وہ واں نہ پہنچے جہاں وہم و خیال
اوس کا پڑے جو عرصۂ ایام پر قدم   ہو جائے نہ وہ قدم کے سوا راہ پائمال
گیسوئے حور نے اوسکے نعل آہنین کیا   جنت میں لے گئی ہے صبا اوسکی دم کا بال
نقاش زیں پہ جیسے کہ جوزا میں آفتاب   زین اوسکی پیٹھ پہ فلک سیر پہ ہلال
جس جس جگہ زمیں پر اوس کا قدم پڑا   راتوں کو جلوہ گر ہوئے واں بدر او ہلال

قصیدہ در منقبت حضرت امام زین العابدین علیہ السلام

تھی بسکہ ہجر خواب عدم بیقرار چشم   کھلتے ہی منہ گئی میری مثل شرار چشم
حیران کارگاہ سپید و سیاہ دہر   دن رات رہتے ہیں میری آئینہ دار چشم
گریہ نے اوسکے نوح کا طوفان دکھا دیا   یعقوب کی بھی تھی نہ یہ زار و نزار چشم

قصیدہ دیگر در مدح حضرت علی اکبر علیہ السلام

ہے یہاں قلم فکر کی جاگیر ہوا پر کیونکہ اسے حاصل نہ ہو توقیر ہوا پر
یوں جامۂ شبنم سے عیاں ہے تیرا پنڈا جوں ہووے گل سرخ کی تعمیر ہوا پر
کشتی مری کیوں باد مخالف نے بہا دی ثابت تھی مری کون سی تقصیر ہوا پر
کر فکر قصیدے کی بس اب چھوڑ غزل کو اتنا بھی نہ اوڑ اے خامہ تحریر ہوا پر
سوا اوسکے لیئے وہ جو ہے ہم شکل پیمبر اور رخش کو نت جسکے ہے توقیر ہوا پر
یعنی علی اکبر خلف بفنعت حیدر مژگاں سے چلے جسکے سدا تیر ہوا پر
اوڑتا ہوا دیکھے جو عقاب اوسکا ہوا میں ہو پر عقاب اوسکا عناں گیر ہوا پر
تو ماحی بدعت ہو تو آواز مغنی پر دے سے نجاوے دم تحریر ہوا پر
اب آئے ہے جی میں کہ لکھوں خاتمہ اسکا کر اک غزل تازہ کی تعمیر ہوا پر
ایک تیر میں اوچھلا تیرا نخچیر ہوا پر ڈرتا ہوں نہ اوڑ جائے کہیں تیر ہوا پر

نامہ میرا تا کوچہ معشوق نہ پہنچا
اور اوڑکے کبوتر کبھی ہوئے نہ پیر ہوا پر

ایضاً

ستاروں سے زبس سقف فلک ساری مجاز ہے بہار کہکشاں رشک دم طاؤس خوش پر ہے
فلک کی طبع میں یہاں تک تو ہے تلخی و شیرینی
کہے تو ہر ستارا بیضۂ باز و کبوتر ہے

جلد سوم در مدح سلاطین و امراحال

در مدحِ جہاندار شاہ

برسرِ خلقِ خدا پرتوِ لطف اللہ
صاحبِ عالم لقب تو ہے جہاندار شاہ
کہتے ہیں اہلِ جہاں جس کے تئیں ماہِ نو
سو تو وہ تیرا ہی ہے سایۂ پرِ کلاہ
گرچہ گدا ہوں ولے خسروِ ملکِ سخن
جانتے ہیں مجھ کو سب زمزمہ سنجانِ آہ
مجھ سے ہیں سب روشناس دلی کے خُرد و بزرگ
نالہ برآوردہ ہوں تا بہ خواصانِ شاہ
لیک گیا میں نہیں پاس کسی کے کبھو
دل سے پرے ہے میرے دورسِ حُبِّ جاہ
میرے سوا کون ہے بیکس و مسکین و غریب
اب کہ وطن سے نکل اپنے ہوا ہوں تباہ
جورِ فلک سے نہیں یہاں مجھے کوئی مفر
اس لئے اب اس در تلک آیا ہوں دادخواہ

قصیدہ در مدحِ صاحب عالم

آیا ہے کیا چمن میں مگر تاجِ بہار
کھولے ہیں ہر طرف کو جو غنچوں نے اپنے بار

پھسلے ہے دیکھنے میں خریدار کے نظر
ہے بحر ماں اب رواں بسکہ آبدار

جاتا ہے جو کوئی سوئے بزاز کل شوق
اپنی طرف کو لیتی ہے ململ اوسے پکار

نازک قماشی گل رعنا پہ کر نظر
پیدا ہے روئے کار سے خوبی پشت کار

گرد اس کے ہو رہی ہے جو بلبل اوسے مگر
ہے لولہ ؟ غنچے کے سینے کا خار خار

ہے بادلہ پہ جوئے رواں کے نگاہ چرخ
خواہاں ہوا ہے مخمل سبزہ کا زنگار

خورشید کے بھی جی میں یہی ہے کہ کیجیے
زر بفت جعفری پہ زر جعفری نثار

ورزش کا بسکہ گرم ہے بازار ان دنوں
ہے تار کو حریر پہ رگ گل کا انتشار

مرزا مزاج پھرتے ہیں ازبسکہ زر لیئے
ٹک کھولتے ہی بک گئے قالین لالہ زار

کی ہے پسند سرو نے اداں فاختہ
آزادی اسکی اس سے ہی ہوتی ہے آشکار

موقوف اقمشہ پہ نہیں یہاں جو دیکھئے
ہر قسم کی متاع و نفائس ہیں بے شمار

دل نے کہا یہ مجھ سے کہ شبنم کے دانوں سے
لے نذر بادشہ کے لیئے موتیوں کا ہار

فخر زمانہ صاحب عالم فلک شکوہ
بہرام کہ ہے جس کے ....

تو ہے وہ تیغ زن کہ تیری تیغ آبدار
گر کوہ پر گرے تو زمیں تک کرے گذار

یورش تو اس کی دیکھ کے گینڈے کی ڈھال پر
لگتے ہی بیٹھ جائے ہے صابن ہیں جیسے تار

یوں جا پڑے وہ فوج پہ دشمن کی ....
لجو برق بادلوں میں کبھی ہوئے آشکار

کج کلاہ اوس کے چہرے پہ یوں خوشنما لگے
دولہا کے سر پہ جیسے سہرے کی ہو بہار

چاندی کا حوضہ اوس پہ کس جائے گر ترا
اور اس پہ تو سوار ہو ہنگام کارزار

یہ تملق دیکھ کر کہے تجھ کو اس گھڑی
نکلا ہے پشت کوہ سے خورشید چہرہ دار

دانت اس کے یوں بلند ہیں ہاتھوں کی طرح سے
خمیازہ کھینچے جیسے سیہ مست پر خمار

قصیدہ در مدح آصف الدولہ بہادر

ہوا ہوں بسکہ میں دور فلک سے سرگرداں
کہ خاک بھی میری جوں گرد باد ہے بے جاں
نسیم صبح اگر آئے ہے چمن سے ادھر
تو سونگھے ہے میرے زخم جگر پہ مشک افشاں
ہے اس کی ذات سے آباد لکھنؤ ورنہ
کہیں ہیں ایسا بہشت ازیں تھا یہ اک دہ ویراں

قصیدہ دیگر در مدح آصف الدولہ بہادر

فلک کیوں نہ ہم کو کرے تیر باراں
زمیں سے نشانا ستادہ ہے پیکاں
نہ نو ہے ہر شب یہ یو نہ سشکاری
کمر بستہ ہے نت بصید غزالاں
صبا جو گئی باغ سے دامن افشاں (غزل)
کیا ٹکڑے ہر گل نے اپنا گریباں
ملے گر مسیحا تو میں اوس سے پوچھوں
کہ بیمارئ مرگ کا کیا ہے درماں
گلی میں تیری اتنی لاشیں پڑی ہیں
کہ ایک ایک جب پہ ہے گنج شہیداں
مجھے دیکھکر خلق کہتی ہے اس کو
ذرا رحم کر اس پہ اے نا مسلماں
بہار ایسی لالہ میں تیرے کہاں ہے
میرے داغ سینہ کے دیکھ آکے نعماں
نہ ٹھہرا کہیں موج بینی کا مارا
نہ اوچھلا کبھی غرق چاہ زنخداں
میرے دوش سے بار سر کو اتارا
بنرئ تیغ کا ہوں میں ممنون احساں
طبیعت ہے اپنی بھی ہر اک طرح کی
کہو ہم سے الجھے نہ زلف پریشاں

پڑھ اے مصحفی تازہ اب اور مطلع
تو آخر تو ہے وقت کا اپنے سحباں

ایضاً در مدح آصف الدولہ بہادر

منہ سے برقع کو مری جاں تو اگر دیوے کھول	تجھ سے خوبان طرب نازدا لیویں مول
جس زمیں پہ کہ ترا عرق افشاں ہووے	کیا عجب واں سے جو بیجا دیں گلہ معنی زول
وہ جو مفلس ہیں جو ہوتا ہے کچھ انکے گھر میں	پھینک آتے ہیں اسے چوک میں جا خاک کے مول
اور جو ہیں صاحب عزت ہے انہوں کی یہ معاش	تھے سلح خانہ جہاں واں نہیں اب ایک تنبول

ایضاً در مدح آصف الدولہ بہادر

جب سے ——————	جس طرف دیکھیے پانی سے بھرے ہیں جل تھل

قصیدہ دیگر نواب محبت خان

...... چسپاں تھے میرے خون کو خنجر کے ساتھ	رہ گیا ہے جل ہو کر تیغ ہر جوہر کے ساتھ

آنکھ تیری ہی سمجھ اوسکو بہت ہم خوش ہوئے   جا لڑی آنکھ اپنی گر شب کو کسی اختر کیساتھ
جو سلیماں تھے کئے اس نے غبار رہ مور   زور کس کا چل سکے ہے چرخ زور آزما کیساتھ
کس کی مژگاں نے مشبک کر دیا سینہ مرا   جو وہ چشمک زن ہیں ہر اک روزن مجمر کے ساتھ
یوں تو ہیں ہر گوشہ اہل دولت و حشمت ہزار   پر نہ دیکھا وہ کہ ہوئے ہمت سنجر کے ساتھ
..... والا فر محبت خاں کہ ہے   دل سے اس کو دوستی ہر صاحب جوہر کیساتھ
بلکہ جو وہ واقف فن شریف شعر ہیں   خود بھی ہیں ہم پنجہ اونکے طبع زور آور کیساتھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیوان اول میاں مصحفی سلمہ فارسی

چہ طعنہ نانِ فراقش بُرد بالا کشی ما را — نفقل یا عشق بسم اللہ مجریہا و مرسیہا
چو آمد کشتیم در ورطہ زین دریائے طوفان زا — ننادا العشق بسم اللہ مجریہا و مرسیہا
بردئے تجبر نازش قدم مستانہ می مانی — نمی دانی تو اے نادان مزاج یار بے پروا را

اے مشرقِ تجلی شوق تو سینہ ہا — اشراق عشق سوختہ این جا سفینہ ہا
روزیکہ خواب ہستی مطلق ظہور خویش — انگندہ شد ز ممکن و واجب ..... ہا
زان کشتگاں کہ طعمہ طمع اجل شدند — فردا زمیں زخاک برآرد دفینہ ہا

قم الساقی طلوع الشمس حد حیض و ناد لہا — کہ در یک گردش پیمانہ آسان است مشکلہا
تو در خوابِ گراں افتادہ غافل چہ میدانی — کہ شب خبر آں راہِ معرفت بستند محملہا

ہست در زمزمہ سوز دگر آواز ترا — ہر نوا زندہ ندارد در دش ساز ترا
از بہر تماشائے گل و لالہ و سوسن — مرغان بدر آرند سر از چاک قفس را
شہیدانِ محبت را زمیں انگند چوں بیرون — دریں موسم چہ پیش آمد ندانم لالہ کاران را
در باغ گل کس ز بلبل شیدا نشان ندید — تا سوخت برق آتش گل آشیانہ را
ہنگام فصل گل بگلستاں گذر فگن — کانجا زمیں بخاک برآرد خزانہ را

گر نالہ اسیر قفس بشنود گہے   مرغ چمن دگر نہ سراید ترانہ را
گر کسے مرتبہ شاعریش فہمیدے   مصحفی ہم بکفن خود قلم مانی داشت
یارب آن ماہ شمع خانہ کیست   سبب عشرت شبانہ کیست
می شنید آنکہ قصہ ام شبہا   گوش او مائل فسانہ کیست
ز [illegible] دان کسے نزدیک من نیست   قبا بر جسم من غیر از کفن نیست
کشد موج ہوا خط بر عذارش   گلے ہرگز چنین نازک بدن نیست
بدور افتادہ ام از یاران بنوعے   کہ ہیچم یاد اکنون از وطن نیست
ہنوز آن بیستون و تیشہ باقی است   مگر یاد دوست کوہکن نیست
سواد سرمہ شام غریبی   بچشم من کم از صبح وطن نیست
ز دیگران چہ شکایت کنم عجب این است   بہ آتش دل من گریہ ہم نہ آب انداخت
نسیم برگ گل از چمن کشید بدل   شرارہ در قفسے تنگ بلبلان انداخت
قاصد باد سحر از طرف گل جستہ بالہ   بہر تسکین اسیران قفس آمد درست
انبہ ہائے سرخ صد تخم شفق آلودہ است   آسمان سبزہ دان عالی و رخش بودہ است
پیش رنگ آتشینش نیست آنے نیاد و آن   بلکہ انگہ را از غلامان کمینش بودہ است
قطرہا گر ابر بر روئے صدف جا مے کند   ہر ثمر مانند نخل تہ گرد آلودہ است
انبہ زرد دگلاں کو بردہ گو از آفتاب   چون ترنج زردست افشان عالی بودہ است
ذائقہ را می کند شیرین خیال صورتش   در نمایش نگہ در زعفران آلودہ است
شیرہ اش را شیرہ جان دست بیعت میدہد   نکہتش باد بہار مشک و عنبر بودہ است
محض شیرین یا تیرہ نیشکر است اندر سبو   نیمہ سرکہ انگبین ترشی بخود افزودہ است

انبه بے ریشه خود باشد گوارائے مذاق   ریشه دارش شاهد شیرین نوخطا بوده است
این جواب آن غزل کو گفته انشا مصحفی   بارها خورده بهشتی سیب عنبر سوده است
آدمی مشت غبارے بیش نیست   لمعه هستی شرارے بیش نیست
گل بچشم بے نوا خارے بیش نیست   غنچه ها مشت شرارے بیش نیست
رشته آمد رشته دل هائے نفس   در کف نقدیه تارے بیش نیست
آمد بهار و پیرهن غنچه ها درید   دست جنون دگر بگریبان دوچار شد
گل کرده خنده بگلستان که ناگهان   آتش بآشیانه مرغان دوچار شد
دران مقام که بود آشیانه بلبل   فتاده برقے و آتش دران مقام کشید
کس چه داند که بباغ آمد بهار   چه قیامت بسر مرغ گرفتار آورد
تنها قفاسے قافله ماندم زبے بیکسی   کردند دوستان سفر زین دیار حیف
اگرچه داد بمن یا تلخ تر دشنام   بشهد غوطه زد از لعل چون شکر دشنام
چه بد کرده بر من ندانم با تو اے کافر   بمن هر بدی کنی چندانکه الفت بیشتر گیرم
رسید فصل اسیری و می طپید دل زار   سرائے خانه صیاد می توان کردن
از نوک کلک زمزمه سیر افگنده ام   گلهائے تازه را بگریبان ریخته
مرزا دبیر گرچه بنا خوش نهاده لیک   افزون شده از عمارت من شان ریخته
آن فارسی که ریخته گویان نوشته اند   صد فارسی حیف است بقربان ریخته
گر مصحفی بدیده انصاف بنگری   خوشتر زمن کجاست زباندان ریخته
فراموش کردی من بے زبان را   همین بس که از من شکایت نداری

PR
2198
M87Z86